اُردو مرکز لائبریری

پیامِ زندگی

جلدِ یازدہم

مرتبۂ اُردو مرکز لاہور

...کپور اینڈ سنز پبلشرز انارکلی لاہور

اردو مرکز لائبریری

اردو ادب کے جاں فروز مرثیوں کا علمی انتخاب

پیامِ زندگی

جلد یازدہم

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
(اقبال)

مرتبہ

مولینا تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج ایڈیٹر ادبی دنیا

بہ اعانت

حضرات ارکین اردو مرکز لاہور

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز لاہور

اُردو مرکز لاہور

ملک کی واحد اکیڈمی (اُردو مرکز لاہور) انتخاب ہفت کشور پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں ذیل کے اہم مقاصد کی تکمیل کیلیئے ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے۔

(۱) اردو لٹریچر کے ذخیرۂ بیکراں میں سے اُس جاندار اور مفید حصے کو جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے حتّی الامکان تاریخی ترتیب کے ساتھ مجلّدات میں شائع کرنا۔

(۲) اُردو زبان کی مکمّل انسائیکلوپیڈیا کی تالیف۔

(۳) ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب۔

(۴) اُردو مرکز کی مجلس ادبا (جو درحقیقت اُردو زبان کیلیئے ایک ادبی دار الافتاء ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع و تنازع فیہ امور کے متعلق ناطق فیصلہ کرنا۔

ایک باوقار علمی جماعت جسمیں ملک کے سرآوردہ اہلِ قلم و منتخب انشا پرداز شریک ہیں۔

اُردو مرکز مذکورہ بالا اہم مقاصد میں سے پہلے مقصد کی تکمیل پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کیئے ہوئے ہے اسکی پہلی زرین کوشش تیس گرانقدر مجلدات کی صورت میں قدرشناس نگاہوں کے سامنے پیش کیجاتی ہے۔ آنریبل سر شیخ عبد القادر بالقابہ۔ خان بہادر شیخ نور الٰہی آئی - ای - ایس پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی جیسے نقادانِ ادب کے مشوروں کے ماتحت یہ مجلدات جماعت اُردو مرکز نے ترتیب دئے ہیں۔ قدرشناس اہلِ نظر نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ تو ہم کم و بیش ڈیڑھ سو مجلّدات شائع کرکے اُردو مصنّفین کو بڑی بڑی لائبریریوں سے بے نیاز کردینگے +

تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج۔ ایڈیٹر اتحاد و چیف ایڈیٹر اردو مرکز لاہور

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس واقع ایبٹ روڈ لاہور میں باہتمام بابو گوراند تامل صاحب منیجر شائع ہوئی

فہرست

پیامِ زندگی

جلد یازدہم

شہادت حضرت علی اکبرؓ

میر انیس	۲
میر نفیس	۴۲
مرزا اوج	۶۸
حضرت رشید	۸۳
حضرت امین	۹۰

شہادت حضرت علی اصغرؓ

حضرت فصیح	۱۰۰
میر ضمیر	۱۰۲
حضرت خلیل	۱۰۳
حضرت تشفی	۱۰۶
مرزا دبیر	۱۰۸

میرانیس	۱۱۱
میر مونس	۱۱۲
حضرت امین	۱۱۹
حضرت تعشق	۱۲۱

جلد دوم

حضرت علی اکبر

و

حضرت علی اصغر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی اکبرؓ

جلد دوم

میرانیس

حضرت علی اکبر جناب امام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔ کہ اب اذنِ وغا مرحمت ہو

واقعہ نگاری

تھرا گئے سنکر یہ سخن اکبرِ ذیجاہ — کی عرض یہ بندے سے نفرمایئے یا شاہ
میں آپ پہ دیکھوں ستم لشکرِ گمراہ — اُسدن کو زمانے میں نہ رکھے مجھے اللہ
حضرت کو قسم دیتا ہوں محبوبِ خدا کی
اب مجھ کو رضا دیجئے میدانِ وغا کی

رخصت کا جو اکبر نے سخن منہ سے نکالا — صدمہ سے ہوا شہ کا کلیجہ تہ و بالا
بیتاب ہو گئے گویا کہ لگا قلب پہ بھالا — ہاتھوں سے کمر چھوڑ دی اور دل کو سنبھالا
حالت ہوئی تغیر شہنشاہِ زمن کی
کی آہ اِک ایسی کہ زمیں ہل گئی رَن کی

حصولِ اجازت کے بعد حضرت علی اکبر والدہ اور پھوپھی کی خدمت میں حاضر ہو کر رُخصت طلب ہوئے

بانوؔ نے کہا مجھکو نہ سمجھاؤ بلا لوں، کیونکر تری رخصت کا سخن منہ سے نکالوں
کھوؤں اسے اٹھارہ برس تک جسے پالوں میں دل کو سنبھالوں کہ کلیجے کو سنبھالوں
ٹھہرو کہ دم اکھڑا ہوا سینے میں ٹھہر جائے
ایسی نہ کرو بات کہ مادر ابھی مرجائے

آخر بمشکل اجازت حاصل کر کے اور رخصت ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچے اور اس طرح رجز خواں ہوتے ہیں۔

لو میاں سے لیتا ہوں میں تلوار خبردار اب گرتی ہے یہ برقِ شرربار خبردار
عرصہ نہیں چلتا ہے مرا وار خبردار آیا میں خبردار خبردار خبردار
ان بازوؤں میں زور ہے خیبر شکنی کا
رو کے مجھے دعویٰ ہو جسے تیغ زنی کا

حضرت علی اکبر مصروفِ جنگ ہوتے ہیں، فوج شام کی کثرت کا بیان شاعر اس طرح کرتا ہے۔

کثرت کے سبب سایہ کو جاگہ[۲] نہ کہیں تھی
لشکر کی صفیں تھیں کہ زمیں چیں بجبیں تھی

معرکہ آرائی

لشکر میں در آئے علی اکبر صفتِ شیر بجلی سی چلی شام کے بادل پہ جو شمشیر

۱؎ حضرت شہربانو حضرت علی اکبر کی والدہ محترمہ ۲؎ جگہ کی بجائے جاگہ کہا ہے۔ درست ہے، لیکن متروک

بے سر ہوئے سردار زبردست ہوئے زیر لاشوں کے چپ و راس نظر آنے لگے ڈھیر

چیدہ جو بہادر تھے وہ بیدم ہوئے دم میں

ہر سمت صفیں بچھ گئیں میدانِ ستم میں

تلوار کی تعریف میں اس بند کی ایک بیت خوب ہے۔

معرکہ آرائی

کیا عزم تھا اللہ رے جری واہ رے ہمت لڑنے میں نظر آئی جدھر تیروں کی کثرت

پہنچا وہیں وہ شیرِ نیستانِ شجاعت تلوار میں تھی برقِ جہاں سوز کی خصلت

اعدا کو سنبھلنے کی بھی فرصت نہ ذرا دی

معلوم ہوا آگ نیستاں میں لگا دی

تلوار کی تعریف

ہر سو صفتِ برقِ اجل جاتی تھی تلوار گہ سر پہ کبھی زیرِ بغل جاتی تھی تلوار

جل جاتا تھا جس غول[۱] پہ چل جاتی تھی تلوار ہر صف کو قلم کر کے نکلجاتی تھی تلوار

دل فوج کا بے جلتے ہوئے صحرا سے نہ کم تھا

میدانِ ستم آگ کے دریا سے نہ کم تھا

پہنچی جو چمک کر کسی ظالم کی سپر تک بجلی سی سپر سے وہ گئی کاسۂ سر تک

اللہ رے صفائی نہ ہوئی اسکو خبر تک یہ سر سے گئی سینے پہ سینے سے کمر تک

کاٹی کمر اس طرح سے دو کر کے زرہ کو

جس طرح کوئی کھول دے ناخن سے گرہ کو

۱؎ غول یعنی گروہ

واقعاتِ غم

صف برچھیوں والوں کی لب نہر کھڑی تھی چلتی تھی اِدھر تیغ اُدھر آنکھ لڑی تھی
سر کھولے ہوئے ڈیوڑھی پہ ماں غش میں کھڑی تھی فریاد کا تھا شور قیامت کی گھڑی تھی
یہ دردِ جگر تھا کہ نہ اٹھ سکتے تھے شبیّر
دل تھامے ہوئے رن کی طرف تکتے تھے شبیر

ناگاہ فوج شام سے نعرہ مسرّت بلند ہوا۔ مجروح حضرت علی اکبر کی آواز حزیں آپ سنتے ہیں۔ اور فرزند کی تلاش میں بیقرار ہو کر روانہ ہوتے ہیں شاعر اس موقعہ پر جناب امام کی حالت بیان کرنے کے سلسلہ میں کہتا ہے۔ کہ

دوڑے یہ نہ میدان نہ ڈیرا نظر آیا
دن تھا مگر اس وقت اندھیرا نظر آیا

اس کے بعد جناب امام فرزند کے قریب پہنچتے ہیں۔ حضرت علی اکبر جناب امام کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور طائر روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتا ہے

رفقائے حسینی کام آچکے اب حضرت علی اکبر آمادۂ شہادت ہیں اس موقع پر شاعر کہتا ہے۔

بیٹا کیا جاتا ہے ہوتا ہے بھرا گھر برباد ہوتی ہے دولتِ فرزندِ پیمبرؐ برباد
کرتے ہیں اپنی جوانی علی اکبر برباد جان کھوتا ہے پدر ہوتی ہے مادر برباد
داغِ اولاد ہے یاں صبر کا مقدور نہیں
پہلے فرزند سے مرجائیں تو کچھ دور نہیں

واقعی دولتِ اولاد عجب دولت ہے
اُس کو راحت ہے تو ماں باپ کو بھی راحت ہے

نوجوان بیٹے کا مرنا بھی بڑی آفت ہے
زندگی تلخ ہے پھر جینے کی کیا لذت ہے

اس کا دل دیکھو چھٹے باپ سے جس کا بیٹا
اور بیٹا بھی وہ ہم شکلِ نبی سا بیٹا

مرقع نگاری

ماں[1] کو منظور ہے جائے نہ کہیں نورِ نظر
اور فرزند کو درپیش ہے دنیا سے سفر

باپ کو غم ہے کہ چھٹتا ہے برابر کا پسر
سیدھی ہو سکتی نہیں خم ہوئی جاتی ہے کمر

بھائی کے واسطے قاسم کی دُلہن[2] روتی ہے
پکڑے دامانِ قبا چھوٹی بہن[3] روتی ہے

رن کو جانے کے لئے بانو کے جائے ہیں کھڑے
شوق ہے جنگ کا ہتھیار لگائے ہیں کھڑے

دل کو پکڑے ہوئے گردن کو جھکائے ہیں کھڑے
ماں سے مرنے کے لئے آنکھ چرائے ہیں کھڑے

شاہ[4] خاموش ہیں پر بول نہیں سکتے ہیں
کبھی بانو کا کبھی بیٹے کا مُنہ تکتے ہیں

واقعہ نگاری

بانو کہتی تھی کہ کیا کہتے ہیں اکبر یا شاہ
ان کے جو دل میں ہے کچھ آپ ہیں اس سے آگاہ

دیکھتی ہوں کہ میں حضرت کی بھی حالت ہے تباہ
ماجرا کیا ہے یہ کچھ مجھ سے تو کہیے للہ

منہ سے کچھ کہتے نہیں پاس ادب کرتے ہیں
کون سی چیز ہے جو ماں سے طلب کرتے ہیں

۱؎ یعنی حضرت شہربانو ۲؎ یعنی حضرت کبریٰ (جناب حسین کی صاحبزادی) ۳؎ حضرت سکینہ ۴؎ یعنی حضرت امام حسین

حضرت علی اکبر والدہ محترمہ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ میدانِ کارزار میں جانے کی اجازت دیجئے

ماں کے جذبات

یہ سخن سنتے ہی فرزند سے ماں ہوگئی زرد　　دھیان آیا کہ چلا ہائے پسر بہرِ نبرد
مردنی پھر گئی چہرے پہ اُٹھا دل میں درد　　دیکھ مُنہ بیٹے کا کہنے لگی بھر کر دم سرد

تم سے بچھڑوں گی تو واری میں کدھر جاؤنگی
پھر نہ رخصت کا سخن کہنا کہ مر جاؤں گی

حضرت علی اکبر مایوسانہ انداز میں عرض کرتے ہیں

ماں سے فرزند کو تکرار کا یارا کیا ہے
تابع حکم ہیں ہم دور ہمارا کیا ہے

لیکن :-

آپ کہتی ہیں نجاؤ تو نہ جائیں گے ھم
اپنے ھمچشموں کو پھر منہ نہ دکھائینگے ھم

حضرت شہربانو کس قدر حسرتناک الفاظ میں فرماتی ہیں۔

ماں کی محبت

علی اکبر مری محنت کی طرف دھیان کرو　　اماں واری مری بستی کو نہ ویران کرو
چھوڑ کر ماں کو نہ تم کوچ کا سامان کرو　　پھر فدا ہو جیو پہلے مجھے قربان کرو

مرے جیتے نہ قدم گھر سے نکالو بیٹا
اپنی مادر کا جنازہ تو اٹھالو بیٹا

جذبۂ غیرت

ماں کی تقریر سے مایوس ہوئے جب اکبر اشک آنکھوں سے بہے چاند سے رخسا رونپر
رکھدی تلوار لگے کھولنے ہاتھوں سے کمر بانو گھبرا گئی ٹکڑے ہوا زینب کا جگر
لیکے بیٹے کی بلائیں کہا کیوں روتے ہو
نہیں روکوں گی میں کاہیکو خفا ہوتے ہو

امتحانِ صبر

روکے کہنے لگے بیٹے سے امامِ خوشخو ماں تو دیتی ہے رضا مرنے کی آرزدہ نہ ہو
پھر کہا بانو سے اب مرنیکی رخصت انہیں دو تھا مقدر میں یہی صبر کرو شکر کرو
یہ دعا مانگو کہ تڑپے نہ کلیجا میرا
آزماتا ہے مرے صبر کو مولا میرا

درسِ بصیرت

تمنے اٹھارہ برس کھینچے ہیں گو رنج و تعب بانو پر خواہشِ تقدیر سے ناراض ہیں سب
اس کا میں کون ہوں تم کون ہو جو مرضیٔ رب زور کیا جس کی امانت تھی وہ کرتا ہے طلب
اب نہیں جینے کے عمر اتنی ہی ہم لائے تھے
داغِ فرقت ہمیں دینے کے لئے آئے تھے

ان حالات سے متاثر ہو کر شاعر کی نظر جس چیز پر پڑتی ہے۔ تصویرِ درد وغم نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت علی اصغر (جو حضرت علی اکبر کے شیر خوار بھائی تھے) کے متعلق ایک بیت کہا ہے۔

کچھ زباں سے علی اصغر جو نہ کہہ سکتا تھا جھولے سے رو رو کے بھائی کیطرف تکتا تھا

حضرت علی اکبر سب سے رخصت ہو کر باہر تشریف لائے۔ جناب امام بھی فرزند کے ساتھ ساتھ ہیں آخری رخصت کے وقت جناب حسین نے بے اختیار ہو کر فرمایا۔

کون لیجائیگا تجھ تک مجھے تنہائی میں
آ گیا فرق ابھی سے مری بینائی میں

حضرت علی اکبر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ دشمن کو حضرت علی اکبر کی آمد کی خبر معلوم ہوئی یہ سنکر آپس میں ظالم کہنے لگے۔ کہ:۔

ختم ہے جنگ جو اس رشک قمر کو مارا
بخدا باپ کو مارا جو پسر کو مارا

یہ ذکر تھا۔ کہ حضرت علی اکبر میدان کارزار میں پہنچے۔ آپ کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔ کہ

پر درد بیاں

اُسکو کیا سوجھے گا یہ نور نظر ہے جس کا　　اس کی تاریک ہے دنیا یہ قمر ہے جس کا
دل پہ کیا گذریگی اس کے یہ جگر ہے جس کا　　پوچھو اس ماں کے کلیجے سے پسر ہے جس کا

در پہ خیمے کے کھڑی بیٹے کو تکتی ہوگی
آگ سی ماں کے کلیجے میں بھڑکتی ہوگی

شمر فوج کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔ کہ ہاں علی اکبر کو حاضر کرو حضرت علی اکبر جواب میں فرماتے ہیں

کس طرح لڑتا ہے ہمشکل پیمبرؑ دیکھو
آج شمشیر حسینی کے بھی جوہر دیکھو

معرکہ آرائی

گھسکے یہ فوج میں ڈوبا وہ شجاع ازلی　　نعرہ زن تھا کہ انا ابن حسین ابن علی
تیر چلنے لگے نیزے چلے تلوار چلی　　برق شمشیر دو دم سے صف اشرار جلی
سر قلم ہوتے تھے افواجِ ستم عاری تھی
صفحۂ خاک پہ اک جدولِ خوں جاری تھی

حضرت علی اکبر مصروفِ جنگ تھے۔ ناگاہ کسی دشمن نے نیزے کا ایک ایسا سخت وار کیا۔ کہ سینۂ مبارک سے فوارۂ خون جاری ہوگیا، آپ گر پڑے جناب امام کو خبر ہوئی۔ تو محبت پدری آنکھوں کی راہ اشک بن بنکر برسنے لگی۔ آپ تلاش کناں میدانِ جنگ میں پہنچے اور ایک جگہ حضرت علی اکبر کو آلودۂ خاک وخوں پایا۔ اس موقع پر شاعر کہتا ہے۔ کہ

پُر درد بیان

باپ کو بیٹے کا لاشہ نہ دکھائے اللہ　　گر کے فرزند کے پہلو میں تڑپنے لگے شاہ
ہلتی تھی رن کی زمین گرتے تھے اس درد سے آہ　　متصل لب پہ یہ تھا ہائے پسر غیرت ماہ
قدر جلّادوں نے افسوس نہ جانی تیری
ہائے یہ حسن ترا ہائے جوانی تیری

جناب امام کی آواز سُنکر حضرت علی اکبر چونکے۔ چشم نیم وا سے ایک حسرت بھری نظر ڈالی۔ اور راہی ملک بقا ہوگئے۔

میر مونس

ہاں اے زبان مرقع بزم عزا دکھا	آنکھوں کو آج معرکۂ کربلا دکھا
تصویرِ مقتلِ شہ گلگوں قبا دکھا	اہلِ سخن کو جلوۂ طبعِ رسا دکھا
محشر بپا تو فلکِ لاجورد ہو
نشتر لگیں دلوں پہ وہ لفظوں میں درد ہو

شاعر کہتا ہے کہ میری گرم نوائیوں کا کیا ذکر۔ واقعات ہی ایسے پُر درد ہیں کہ جب کسی اہلِ دل کو خیال آگیا۔

فوراً خیالِ عیش و طرب دُور ہو گیا
شیشے میں دل کے چوٹ لگی چور ہو گیا

شاعر اب واقعاتِ کربلا بیان کرتا ہے۔

واقعہ نگاری

پردیس میں گذر گئے شہ پر یہ درد و غم	اک دو پہر میں فوج ہوئی کشتۂ ستم
محبوب بھانجے ہوئے راہی سوئے عدم	آغوش میں جوان بھتیجے کا نکلا دم
ایسے حسین جو رشکِ قمر تھے دلیر تھے
پیارے وہ مر گئے جو زمانہ میں شیر تھے

حضرت عباس شہید ہو چکے، اب مردوں میں صرف حضرت علی اکبر، حضرت عابد بیمار (صاحبزادگان جناب امام حسین) اور خود جناب امام حسین باقی ہیں۔ اس طرف فوجِ شام پکار کر کہتی ہے

رن میں کسی جوانِ دلاور کو بھیج دیں
یا آپ آئیں یا علی اکبر کو بھیج دیں

واقعہ نگاری

اُٹھ کر پکارے شاہِ دو عالم کہ آئے ہم ٹھہرو وہیں بس اب نہ بڑھانا کہیں قدم
سجنے لگے سلاح یہ کہکر شہِ اُمم گھبرا کے دوڑے اکبرِ غازی بہ درد و غم
جا کر حرم سرائے رسالت پناہ میں
کی عرض لو حضور چلے رزمگاہ میں

حضرت علی اکبر اپنی والدہ محترمہ حضرت شہر بانو کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ پدر بزرگوار جسم پر سلاح جنگ آراستہ کر رہے ہیں، وقت بہت نازک ہے۔ میں کن آنکھوں سے دیکھوں کہ امام عالی مقام میرے سامنے شہید ہوں۔ للہ آپ مجھے اجازت دیجئے۔ کہ پہلے میں سر قدموں پر نثار کروں، یہ سُنکر حضرت شہر بانو سکتہ میں رہ جاتی ہیں، چاہتی ہیں کہ بیٹے کو نہ جانے دیں۔ لیکن جناب امام کا خیال آجاتا ہے۔ تو مجبور ہو جاتی ہیں اور اجازت دے کر فرماتی ہیں۔

جذبۂ ایثار و محبّت

بے بس ہے ماں بھی تم بھی ہو مجبور کیا کرو تنہا ہے باپ جلد سدھارو وغا کرو
اٹھارہ سال کا حق خدمت ادا کرو واری جوان جان کو اپنی فدا کرو
بس اب زباں سے وہ نکہو جو سنا نہ جائے
ڈرتی ہوں مجکو جوش محبّت کا آنہ جائے

یہاں یہ ذکر تھا۔ کہ جناب امام حسین علیہ السّلام تیار ہو کر رخصت ہونے کے لیے عصمت سرا میں تشریف لائے۔ دیر تک تلقین صبر فرمایا کیئے۔ پھر حضرت علی اکبر کی طرف دیکھ کر ارشاد ہوا۔ کہ حرم کی حفاظت تمہارے سپرد ہے۔ اس تقریر سے حضرت علی اکبر کے دل پر تیر سا لگا، کس درد سے عرض کرتے ہیں۔

مولا کلیجہ ہوتا ہے شق اس کلام سے
عابد سے کہئے یہ جو کہا ہے غلام سے

اسی سلسلۂ بیان میں پھر عرض کرتے ہیں۔

جذبۂ ایثار و محبّت

وہ بہر جنگ جا نہیں سکتے کہ ہیں علیل ۔ گھر سونپ جائیے انہیں یا سرورِ جلیل
اپنی تو زندگی کا ہے عرصہ بہت قلیل ۔ گھبرا رہی ہے روح یہ ہے مرگ کی دلیل
تھمئے تو کیا بعید ہے حضرت کے صبر سے
اب گھر سے کیا غرض ہمیں مطلب ہے قبر سے

دیکر دُعائیں کہنے لگی خواھرِ امام ۔ قربان جاؤں سچ ہے بجا ہے یہ سب کلام
یوں جس کے باپ پر ہو ہجوم سپاہ شام ۔ اندھیر ہے کہ رن میں نہ روشن کرے وہ نام
عاقل ہو نوجوان ہو شبیہ رسول ہو
یہ ننگ واقعی تمہیں کیونکر قبول ہو

بانو پکاری گو کہ یہ نازوں کے ہیں پلے ۔ مرنے کا اذن دے کے لگا لیجئے گلے
صدقے ہوں یہ کہ ابنِ علیؑ سے بلا ٹلے ۔ سنئیے تو انکے ہوتے ہوئے آپ کیوں چلے
حضرت تو جائیں تیغوں میں لختِ جگر نہ جائے

صاحب جواں پسر کہیں صدمے سے مر نہ جائے

جناب امام فرماتے ہیں ع

بانو ہم ان کے سامنے مرتے تو خوب تھا

لیکن جب ہر طرف سے اصرار ہوتا ہے۔ تو امام عالی مقام مجبور ہو جاتے ہیں، اور سراپا درد و ضبط بنکر بیٹے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں

اچھا سدھارو باپ ہی لاشہ اٹھائیگا

مرقع نگاری

جب اذنِ جنگ اکبر غازی کو مل گیا
لختِ جگر کے غم میں جگرماں کا ہل گیا
طاقت گئی بدن سے تو پہلو سے دل گیا
اور یاں جری کا غنچہ امید کھل گیا
چہرہ خوشی کے شوق میں گلرنگ ہو گیا
مارے خوشی کے رختِ بدن تنگ ہو گیا

الغرض سب سے رخصت ہو کر حضرت علی اکبر میدانِ کارزار میں پہنچے۔ اور رجز خواں ہوئے۔ فوجِ شام طیاری جنگ میں مصروف ہے۔

تیاری جنگ

کالے نشان کھل گئے تیغیں ہوئیں علم
مانند موج بڑھکے صفیں ہو گئیں بہم
طبلِ وغا پہ چوٹ لگی پڑنے دمبدم
نالے وہ کوس و بوق کے وہ شور زیر و بم
بلوا تمام فوج کا شیر خدا پہ تھا
نیزے بلند تھے کہ نیستاں ہوا پہ تھا

یہ دیکھکر حضرت علی اکبرؓ میان سے تلوار کھینچتے ہیں۔ شاعر اس موقع

پر کہتا ہے۔ کہ

رُخ سے عروسِ فتح کے بُرقع الٹ گیا
ظاہر ہوا ہلالِ ظفر ابر ہٹ گیا

تلوار کی تعریف

یوں میان سے ہوئی وہ جلالت قریں جدا | غل تھا کہ دستِ مرگ سی ہے آستین جدا
تن سے جدا ہے روح مکاں سے مکیں جدا | معنی جدا ہیں آیتِ فتح مبیں جدا

رُخ سے وہ ہٹ گئی جو ردا تھی رُکی ہوئی
گویا دُلہن محافے سے نکلی جھکی ہوئی

معرکہ آرائی

تلواریں کھینچے پہلے پری میں جو تھے سوار | گھوڑے اُٹھائے شبیر پہ اُن سب نے ایکبار
امڈی تھی اِک گھٹا کہ گری برق شعلہ بار | ریتی پہ تھے سوار سواروں پہ راہوار

نُصرت نے دی صدا کہ یہ شیر و نکا داب ہے
ہنستی تھی موت بھی کہ نیا انقلاب ہے

تلوار کی تعریف

تھی تیغ برق سے بھی وہ دشمن شکار تیز | کیا ہو سکے اُدھر جو ہوں تیغیں ہزار تیز
سر تیز ہاتھ تیز دم آبدار تیز | رفتار تیز اور تھی دھار ایسی دھار تیز

بازو قلم تھے اُن کے جو مردِ مصاف تھے
پانی تھا وہ چھری کہ کلیجے شگاف تھے

۱؎ استعارہ ہے مراد تلوار سے ہے۔ ۲؎ استعارہ ہے مراد نیام سے ہے۔

جلوہ جسے دکھا دیا تڑپا گئی اُسے
شوخی پری کی صاف نظر آگئی اُسے
شوریت تن نمکیں بھا گئی اُسے
مُنہ بڑھ کے جسپہ ڈالدیا کھا گئی اُسے
نقشہ اجل کا دیر تلک روبرو رہا
نے استخواں رہے نہ رگوں میں لہو رہا

حریف کی تباہی کے سلسلہ بیان میں یہ بیت نہایت خوب ہے۔

سر گر رہے ہیں یوں سپہ تیرہ بخت کے
جیسے خزاں میں گرتے ہیں پتّے درخت کے

تلوار کی صفائی

جب ضرب کی نہ خود بچانے سپر بچی
پنجہ گرا زمین پہ کلائی اگر بچی
نے سر بچا نہ گردنِ بیداد گر بچی
جوشن بچا نہ صدر بچا نے کمر بچی
کیا تیزیاں تھیں تیغ بہادر کی دھار میں
گھوڑا بھی تھا دو نیم اُسی ایک وار میں

معرکہ آرائی

آفت تھی کس سے ضرب حسام دو دم اُٹھے
ران کا اٹھا جو ہاتھ توان کے قدم اُٹھے
کاٹے سپر سمیت جو دست ستم اُٹھے
گر کر نہ پیر قبیں نہ زمیں سے علم اُٹھے
خود پاؤں پیشتر اجل آنے سے اُٹھ گئے
ذلت اُٹھا اُٹھا کے زمانے سے اُٹھ گئے

گھوڑے کی تعریف میں ایک بیت ملاحظہ ہو

پاکھر ہے آہنی کہ ہے جوشن میں جسم سام
لیلی کے دو نو ہاتھ ہیں گردن میں یا لگام

رخشاں رکاب ہے کہ ہلالِ فلک مقام اتنا ہو تیز گام فرس کا نہیں یہ کام

اڑنا سمٹ سمٹ کے قرینہ ہے شیر کا

آ ہو کے ہاتھ پاؤں ہیں سینہ ہے شیر کا

جو مورچہ بندھا اسے تلوار کھا گئی رونیں تنوں کو برق شرربار کھا گئی

ہر صف شکست جب دم پیکار کھا گئی گھونگھٹ[۱] تمام فوج ستمگار کھا گئی

مجروح تھا جو گر کے وہ پامال ہو گیا

یاں چہرۂ عروس ظفر لال ہو گیا

ہنگامہ رستخیز

ٹکراتی پھرتی تھی پسرِ سعد کی سپاہ کہتے تھے تیرہ بخت کہ دن ہو گیا سیاہ

گھوڑے چراغ پا تھے جو مابین رزم گاہ ظلمت میں ہاتھ آتی انہیں بھاگنے کی راہ

لیکن نظر نہ آتی تھی صورت سوار کی

اندھیریاں پڑی تھیں رخوں پر غبار کی

ناگاہ کسی ظالم نے حضرت علی اکبر کے سینۂ بے کینہ پر نیزہ کا ایک ایسا سخت وار کیا کہ انی ٹوٹ کر رہ گئی۔ لیکن اس وقت بھی آپ کی پیشانی مبارک پر بل نہ آیا۔ نہ صرف اس قدر آپ ضابطہ رہے۔ بلکہ

نعرہ کیا یہ شبر نے سینے کو تان کے

صدقے ہزار ہم سے پسر بابا جان کے

لیکن اتنی ہی دیر میں اور بھی چند جانکاہ زخم کھا کر بیقرار ہو گئے

---

[۱] گھونگھٹ کھا گئی۔ یعنی فوج کا رخ پھر گیا۔

تڑپا اٹھا جھکا جو زمیں پہ وہ مہ جبیں	تر ہو گیا لہو کے دریڑوں سے صدرِ زیں
تھرّا رہا تھا دردِ جگر سے جو وہ حزیں	گردن سے لپٹے جاتے تھے گیسوئے عنبریں

قبضے میں تیغ تیز تھی پر جی نڈھال تھا
ہاتھ اینٹھے جاتے تھے یہ تشنج کا حال تھا

گرتے ہوئے جنابِ امام کو پکارتے ہیں۔ کہ اب وقت آخر ہے۔ صورت دکھا جائیے۔ جناب امام کے گوش مبارک تک جب فرزند کی آواز پہنچتی ہے۔ آپ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کہ اس کی بارگاہ میں یہ ھدیۂ محقّر قبول ہوا۔ اور بے اختیار زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلجاتے ہیں = زندہ ہے وہ جو راہ خدا میں گذر گیا۔ اس قدر فرمانے کے بعد جناب امام فرزند کے قریب پہنچتے ہیں لیکن یہ عالم تھا۔ کہ

غمِ فرزند

صدمے سے کام کرتی نہ تھی شاہ کی نظر	ہاتھوں سے ڈھونڈھتے تھے پسر کو اِدھر اُدھر
سینے پہ ہاتھ جا کے ہوئے جب لہو میں تر	سمجھے حسین تب کہ یہی ہے مرا پسر

غش آیا دم الٹ گیا خاموش ہو گئے
چھاتی پہ منہ کو رکھتے ہی بیہوش ہو گئے

جب آپ کسی قدر ہوش میں آئے تو دیکھا کہ حالت متغیّر ہو چکی ہے۔ اس موقع پر شاعر لکھتا ہے۔ کہ

صدمہ جو نزع روح کا تھا جسم[۱] پاک پر
اک چودھویں کا چاند تڑپتا تھا خاک پر

۱؎ یعنی حضرت علی کے جسم پر

فرزند ہے نوجوان پسر دیکھتے ہیں شاہ
دم توڑتا ہے نورِ نظر دیکھتے ہیں شاہ
برچھی کا پھل میانِ جگر دیکھتے ہیں شاہ
نخلِ مراد کا یہ ثمر دیکھتے ہیں شاہ
تن کانپتا ہے زرد ہے چہرہ جناب کا
اب ہے کوئی گھڑی میں غروب آفتاب کا

جناب امام حسین اپنا دردِ دل بیان کر رہے ہیں۔ یکایک طائرِ روح گلشنِ فردوس کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔

شمر نے حضرت علی اکبر پر نیزے کا ایک ایسا وار کیا کہ انی سینہ کو توڑ کر پشت کی جانب نکل گئی، پھر اس نے نیزہ کو اس زور و قوت سے کھینچا کہ حضرت علی اکبر میں سنبھلنے کی طاقت باقی نہ رہی۔ فوج شام کے سپاہی شمر کو دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد شاعر لکھتا ہے۔ کہ

واقعہ نگاری

اس طرف کہتے تھے آپس میں یہ وہ بانیٔ شر
اور لہو سینے سے اکبر کے اُبلتا تھا اُدھر
باگ کو چھوڑ کے ہاتھوں سے سنبھالا تھا جگر
پاس مظلوم کے بھائی تھا نہ عمّو نہ پدر
زخمی تلواروں سے لشکر کئے جاتا تھا اُسے
خون میں ڈوبا ہوا گھوڑا لئے جاتا تھا اُسے

گھوڑے کی وفاداری

مارتا تھا کوئی نیزے کو برابر جاکر
روکتا تھا کوئی تلوار سے آگے آکر
جب الجھتا تھا قدم باگ سے ٹھوکر کھاکر
دیکھنے لگتا تھا اکبرؑ کی طرف گھبرا کر

تیر بھٹوں پہ جو پڑتے تھے توٹ جاتا تھا
لاشیں آگے کہیں ملتی تھیں تو اڑ جاتا تھا

الغرض وفادار گھوڑا کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اور حضرت علی اکبرؓ کو کسی جنگل کیطرف صاف نکال لے گیا۔ لیکن وفاداری کا یہ عالم تھا۔ کہ رستے میں ہی

کبھی منہ پھیر کے اسوار کی بُو سونگھتا تھا
کبھی ٹپکا ہوا اکبرؓ کا لہو سونگھتا تھا

جنابِ امام عصمت سرا میں تشریف رکھتے ہیں، لشکر شام میں غل ہوا کہ علی اکبرؓ کو قتل کردیا۔ یہ سُنکر جناب امام فرزند کی تلاش میں جانے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ۶ دیکھیئے لاش بھی ملتی ہے کہ پامال ہوئی

غمِ فرزند

کہہ کے یہ فوجِ مخالف میں گئے صورتِ شیر ہاتھ میں تیغ و سپر آنکھوں میں عالم اندھیر
جستجوئے اکبرِ مظلوم کی دل زیست سے سیر دہیں دوڑے گئے جس غول میں چمکی شمشیر

واں بھی ہمشکلِ پیمبر نظر آئے نہ کہیں
دیکھا ایک ایک کو اکبر نظر آئے نہ کہیں

جب آپ تلاش کرتے کرتے تھک گئے۔ تو ایک بڑی دردناک آواز میں پکارا کہ

اے مری راحتِ جاں قوتِ دل نورِ نگاہ دم نکلتا ہے۔ اب آواز سناؤ ںللہ
اے مری چاند مری آنکھوں میں عالم ہے سیاہ جس طرف تم ہو ادھر کی مجھے ملتی نہیں راہ

کیا کرو تم کہ ہے برگشتہ زمانہ اکبرؓ
میری تقدیر میں ہے ٹھوکریں کھانا اکبر

ناگاہ حضرت علی اکبر کی آواز حزیں گوش مبارک میں آتی ہے۔ حضرت علی اکبرؓ اس طرح پکارتے ہیں۔

دم ہے چھاتی پہ رکا کوچ کی تیاری ہے
آئیے جلد کہ ہنگام مددگاری ہے

سنکے آواز پسر سیّد والا دوڑے نیم بسمل کیطرح گر کے ہر اک جا دوڑے
کبھی کھولے ہوئے آغوش تمنّا دوڑے کبھی تھامے ہوئے ہاتھوں سے کلیجہ دوڑے

جاں بلب ہو گئے صدمے یہ جگر پر پہنچے
ٹھوکریں کھاتے ہوئے لاش پسر پہ پہنچے

ایڑیاں خاک پہ بیٹے کو رگڑتے دیکھا نقشۂ ہستی فرزند بگڑتے دیکھا
ہچکیاں لیتے ہوئے سانس اکھڑتی دیکھا اپنا گھر سامنے آنکھوں کے اُجڑتے دیکھا

صبر کی شاہ کے ہاتھوں سے عناں چھوٹ گئی
لاش پہ گر کے کہا ہائے کمر ٹوٹ گئی

شاہ جلدی سے اٹھانے لگے لاش اکبر کانپتے ہاتھوں سے لیکن نہ سنبھلتا تھا جگر
منکا ڈھلکا تا تھا کاندھے سے لگاتے تھے جو سر ڈر یہ تھا دلکو کہ دکھنے نہ لگے زخم جگر

المدد کہہ کے کبھی لاش اٹھا لیتے تھے
ہچکی آتی تھی تو گھبرا کے لٹا دیتے تھے

الغرض بصد دقّت و دشواری جناب امام[1] فرزند نوجوان کو اُٹھا کر خیمہ میں لائے حضرت شہر بانو کا یہ عالم ہے۔ کہ جوش اشک سے کچھ نظر نہیں آتا۔ شاعر اس موقعہ

[1] یعنی حضرت امام حسینؑ ۱۲

کی تصویر لفظوں میں اس طرح کھینچتا ہے۔

ماں کی محبّت

اتنے میں پڑ گئی فرزند پہ بانو کی نگاہ ہاتھ پھیلا کے پکاری کہ مرے غیرت ماہ
تم کو دیکھا جو نہ تھا آنکھوں میں دنیا تھی سیاہ رنگ کیوں زرد ہے کیا پیاس سے حالت ہے تباہ

زخم کس جا ہو جو سینہ خوں میں بھرے ہو بیٹا
چاند سے ہاتھوں کو کیوں لب پہ دھرے ہو بیٹا

پُر درد بیان

کہہ کے یہ چھاتی پہ منہ رکھدیا اور چلّائی مرے اکبر ترے قربان یہ ماں دُکھ پائی
ہے غضب سینۂ پُر نور پہ برچھی کھائی ہائے بیٹا نہ ترے بدلے مجھے موت آئی

کیا علاج آہ یہ ماں کونسا سامان کرے
چاند سی چھاتی پہ کوئی مجھے قربان کرے

حضرت علی اکبر ماں کی آواز سُنکر آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ اور اس طرح تلقین صبر کرتے ہیں کہ سننے والوں کا دل ہل جاتا ہے۔

روئے ماں بیٹے کی باتوں پہ امام ذی جاہ کھینچی اکبر نے بھی اک سینۂ پر درد سے آہ
دست و پا سر دھوئے ہو گیا احوال تباہ پھیر کر آنکھوں کو کس یاس سے کی ماں پہ نگاہ

بانو چلّائی میں صدقے مرے پیارے اکبر
آنکھیں کھولے ہوئے جنت کو سدھارے اکبر

اے بلبل ریاضِ سخن نوحہ خواں ہو آج
اے نرگسِ حدیقۂ غم خوں فشاں ہو آج
اے بحرِ اشک جوش میں آ کر رواں ہو آج
ہاں اے بہارِ گلشنِ خاطر خزاں ہو آج

جاتا ہے خلق سے گلِ نورس حسینؑ کا
جنگل میں باغ لٹتا ہے بیکس حسینؑ کا

مناقب حضرت علی اکبر

چھٹتا ہے وہ پسر کہ جو سب گھر کی جان ہے
حُسنِ نبیؐ کی جس کے سراپا میں شان ہے
خوشخو ہے خوش مزاج ہے شیریں بیان ہے
مہرو ہے سیم تن ہے جری ہے جوان ہے

عارض ہیں پھول سے بھی دو چند آب و تاب میں
سبزہ ابھی شروع ہے باغِ شباب میں

حضرت علی اکبر کو آمادہ سرفروشی دیکھ کر جناب امام پر جو عالم طاری ہے شاعر نے اس کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے

منہ فق ہے اشک چشم سے پیہم نکلتے ہیں
نرگس کے گل سے قطرۂ شبنم ٹپکتے ہیں

اور یہ خبر سُنکر حضرت علی اکبر کی والدہ محترمہ حضرت شہر بانو خیمہ عصمت میں مجسمۂ صبر بنی ہوئی ہیں۔ اس طرح مصروف دعا ہیں

مضطر نہ ہوں یہ لال جو مرنے کا نام لے
یارب مرے تڑپتے ہوئے دل کو تھام لے

حضرت علی اکبر جناب امام سے درخواست کرتے ہیں کہ اب اجازت دی جائے امام کس قدر درد انگیز لفظوں میں جواب دیتے ہیں۔

دل مانتا نہیں کسی صورت میں کیا کروں
دی ہے خدا نے تیری محبت میں کیا کروں

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اے علی اکبر اگر شوق شہادت اس قدر بیتاب کئے ہوئے ہے۔ تو تھوڑا توقف کرو۔ پہلے مجھے سر کٹانے دو۔ حضرت علی اکبر عرض کرتے ہیں کہ والد نامدار یہ آپ کیا فرماتے ہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ اپنی آنکھوں سے آپ کو زیر خنجر دیکھوں۔ اسی سلسلۂ بیان میں یہ بند ملاحظہ ہو۔ کس قدر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔

پُر درد بیان

بیٹا وہ کیا جو دکھ میں پدر کے نہ آئے کام ایسا پسر تو غیر سے بدتر ہے یا امام
عسرت سرائے دہر میں کیا کوچ کیا مقام مرجائیں ہم اسی میں ہے عزت اسی میں نام
زندہ ہے وہ پسر جو تصدّق ہو باپ کے
اٹھارہ سال جی چکے سایہ میں آپ کے

اندازِ طلب

دیجے رضا کہ مالکِ صبر و رضا ہیں آپ شاکر ہیں آپ تابع حکمِ خدا ہیں آپ
سر چشمۂ عنایت لطف و عطا ہیں آپ ابرِ کرم ہیں آپ محیط سخا ہیں آپ
میں کون ہوں بھلا جو سماؤں نگاہ میں
حضرت تو گھر لٹاتے ہیں خالق کی راہ میں

واقعہ نگاری

بولے پسر سے رو کے امام فلک مقام یاد آئیگی پدر کو یہ شیرینی کلام

راضی رضائے حق پہ ہے شبیر تشنہ کام گھبرائیے نہ آپ کہ مطلب ہوا تمام
ہم نے تو صبر کر کے خدا پر نگاہ کی
مادر سے بھی تو لیجیے رضا رزم گاہ کی

حضرت شہر بانو نے درِ خیمہ سے کچھ آثار ایسے پائے جن کا اندیشہ تھا یعنی یہ کہ شاید جناب امام انہیں رضائے جنگ دے چکے ہیں۔ حضرت زینب فضہ سے فرما رہی ہیں۔ کہ ذرا معلوم تو کر۔ دیکھ تو بھائی علی اکبر سے کیا کہہ رہے ہیں ۔ پھر حضرت شہر بانو سے کہتی ہیں

تقریر اُن کی نامِ خدا لا جواب ہے انداز گفتگوئے رسالت مآب ہے
بلبل کو خوش بیانی سے اُنکی حجاب ہے راضی نہ کریں شہ کو مجھے اضطراب ہے
غمگین دل شبیہ[۱] محمد[۲] کیا نہیں
ان کا سوال شہ[۳] نے کبھی رد کیا نہیں

جذبۂ ایثار و شہادت

یہ ذکر تھا کہ اکبرِ مہ رو محل میں آئے ماں سے کہا کہ رَن کی رضا ہم پدر سے لائے
ہو آپ کا بھی حکم تو خادم دغا کو جائے سر تیغ سے کٹائے سعادت جہاں میں پائے
عزت رہے نثار جو یہ سر فروش ہو
نزدیک ہے کہ شمع امامت خموش ہو

ماں کا جذبۂ محبت و ایثار

وارث[۳] کا حال سنکے جگر تھر تھرا گیا آنسو بھر آئے ابر الم دل پہ چھا گیا

۱؎ یعنی حضرت علی اکبر سے ۲؎ و ۳؎ سے مراد امام حسین سے ہے۔

رقت ہیں اور کچھ نہ زباں سے کہا گیا بیساختہ زبان پہ یہی حرف آگیا
سب گھر نثار دلبرِ خیر الانام[1] پر
اچھا میں صدقے جاؤں فدا ہو امام پر

والدۂ محترمہ سے رخصت ہو کر حضرت زینب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رخصت طلب ہیں۔ حضرت زینب نے اپنے بھتیجے حضرت علی اکبر کو خود پرورش کیا تھا۔ اس لئے انہیں بھی حد درجہ محبّت تھی۔ چنانچہ صاف انکار فرما دیتی ہیں، حضرت علی اکبر عرض پیرا ہیں۔

فرزند کا جذبۂ محبّت

مرضی یہ آپ کی ہے کہ پیارا پسر جیے پر[2] اس سے کیا حصول کوئی دم اگر جیے
جینا ہے موت جب نہ شہِ بحر و بر جیے مشکل ہے اُن کے بعد جو یہ نوحہ گر جیے
پچھتائیگا وقت جو رخصت کا ٹل گیا
بابا ادھر گئے کہ ادھر دم نکل گیا

یہ کہہ کے رکھ دی تیغ کمر سے نکال کے کاندھے سے کھولنے لگے گروے کو ڈھال کے
دیکھے جو طور بنتِ علی نے ملال کے فرمایا ہاتھ چاند سی گردن میں ڈال کے
صدقے گئی یہ کیا کہ دل افسردہ ہو گئے
اللہ اتنی بات پہ آزردہ ہو گئے

ہے بچپنا مزاج میں اتنک تمہارے واہ نازو نیاز کے یہ سخن تھے خدا گواہ
جاؤ سدھارو شوق سے تم سوئے رزمگاہ اے لال مرنے والوں کی روکی ہے کسنے راہ

[1] خیر الانام: حضور نبی کریم ؐ کیلئے مخصوص لفظ۔ دلبر خیر الانام سے مراد حضرت امام حسین۔

ایسی تھی میں کہ رکھتی خفا کر کے آپ کو
دیکھا اسی بہانے سے جی بھر کے آپ کو

محاکات

سرخی یہ سُنکے چہرہ انور پہ آگئی گویا کہ اپنا رنگ شہادت دکھا گئی
کیفیت مے اجل آنکھوں میں چھا گئی آہوں کی بیبیوں کی فلک تک صدا گئی
ٹوٹا تھا کوہِ غم جو دل دردناک پر
ماں کا یہ حال تھا کہ تڑپتی تھی خاک پر

حضرت علی اکبر خیمہ سے برآمد ہوئے۔ اور جناب امام حسین علیہ السلام سے رخصت ہو کر میدان کارزار میں پہنچے۔ اور مصروفِ جنگ ہیں۔ حریف کا یہ عالم ہے۔ کہ

معرکہ آرائی

یہ صف گئی تو دوسری صف پر جھپٹ گئے اک وار میں اُسے بھی بچھا کر پلٹ گئے
ڈھالوں کے جا بجا تھے جو بادل وہ پھٹ گئے اعدا کے دم الٹ گئے سر تن سے کٹ گئے
بہنے لگا گلوں سے لہو ناؤداں کی طرح
پھولی زمین پر بھی شفق آسماں کی طرح

تلوار کی تعریف

اللہ رے تیغ اکبر مہ رو کی آب و تاب کٹتا تھا جسکے عکس کے جلوے سے آفتاب
یکتا برش میں سیف زبانی میں لاجواب اعدا کے قتل کرنے پہ بیباک و بے حجاب
ہر وار اس کا تشنہ خونِ شریر تھا
جوہر اُبل پڑے تھے یہ جوشِ خمیر تھا

شوخی میں رشکِ شاہدِ طنّازِ دلفریب گرمی میں مثلِ صاعقہ بے صبر و بے شکیب
بجلی سوئے فراز تو دریا سوئے نشیب تھی کیا ہی رخت اطلسِ خوں کی بدن پہ زیب
آفت تھا سر جھکائے وہ ڈھنگ اس کی چال کا
دھوکا تھا شامیوں کو شفق میں ھلال کا

جوشِ وغا

تھے غیظ میں رئیس علی اکبر بھرے ہوئے دم میں صفیں الٹ گئیں خالی پرے ہوئے
پیدل چھپے سواروں میں پیچھے ڈری ہوئے پامال ہو گئے جو پڑے تھے مرے ہوئے
مارا تھا سرکشوں کو جو ٹاپوں سے داب کے
تھے دست و پا لہو سے حنائی عقاب کے

گھوڑے کی تعریف میں شاعرانہ انداز و مبالغہ ملاحظہ ہو۔

دم بھر اسے قرار نہ تھا رزمگاہ میں گویا کہ پھر رہا تھا چھلاوا نگاہ میں
بجلی سا کوندتا تھا عدو کی سپاہ میں مرصر تو رہتی جاتی تھی تھک تھک کے راہ میں
ہر صف میں یوں اڑا کہ نہ گرد اک ذری اڑی
طاؤس بن کے باغ سے گویا پری اڑی

عمر سعد نے دو نو جوان اپنی فوج سے حضرت علی اکبر کے مقابلہ کے لئے روانہ کئے اور سامنے آ کر ایک اُن میں سے معرکہ آرا ہوا۔

معرکہ آرائی

بل کھا کے اس[۱] نے ہاتھ میں نیزے کو دی لکان زانو میں یا دپا[۲] کو مسل کر کہا کہ ہاں

۱؎ ذرا کے معنوں میں اب متروک ہے۔ ۲؎ یعنی حریف نے

اڑنے لگا ہوا سے کمیت سبک عناں شعلہ سی داہنے بائیں لپکنے لگی سناں

اکبر بھی تھمنے دیتے نہ تھے رہوار کو
کس کس ہنر سے روکتے جاتے تھے وار کو

گھوڑے کی تعریف

بجلی تھا دونوں باگوں پہ شدیز خوش سیر اڑنے میں گاہ بن گیا سیماب گہ شرر
پلٹا ادھر کو یہ اُدھر آئی سناں اگر چمکی ادھر توکل کی طرح پھر گیا ادھر

زد سے بچا کے ابن شہ ارجمند کو
چھل بل دکھا رہا تھا عدو کے سمند کو

معرکہ آرائی

جب وار کر چکا وہ جفا کار تین چار آواز دی جری نے کہ روک اب ہمارا وار
کی طعن نیزہ دوڑ کے پھر اُسنے ایک بار آپہنچی تھی سناں کہ چلی تیغ آبدار

دو کر کے ڈانڈ آئی گئی اس صفائی سے
کہنی سے ہاتھ اُڑ گیا پنجہ کلائی سے

حضرت علی اکبر نے حریف کو نیزے پر اُٹھالیا۔

زور بازو

اکبر اٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے گفتگو نامرد بول ہم ہیں زبردست اب کہ تو
کیا بولتا وہانِ اجل میں وہ کینہ جو پٹکا شقی کو شمر ستمگر کے روبرو

اژدر کی طرح سانس جو لی خود پسند نے
رکھدیں جھپٹ کے سینے پہ ٹاپیں سمند نے

اسکے بعد دوسرا حریف مقابل ہوتا ہے اور پے در پے وار کرتا ہے لیکن

غلبہ ہو آفتاب پہ کیا مشتِ خاک کو
تلوار کی ہوا نہ لگی جسمِ پاک کو

حریف نے رجز خوانی کے سلسلہ میں دعوٰے کیا تھا۔ کہ

سرکا نہیں کبھی میں صفِ کارزار سے
اکثر لڑا ہوں رن میں اکیلا ہزار سے

اپنے ہر حملہ کو بیکار دیکھکر خوف وہیبت سے حریف رعشہ بہ اندام ہوگیا۔ اب جناب علی اکبر اس کے دعوٰے کا اس طرح جواب دیتے ہیں۔

لڑتا ہوں میں ہزار سے کس کا یہ قول تھا
نام دیکھنے ہی کا یہ ڈیل ڈول تھا

آخر کار حریف کو قتل کر کے حضرت علی اکبر فوج شام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا جس کو حوصلہ ہو۔ سامنے آئے۔ اس مرتبہ فوج خود حملہ آور ہوتی ہے یہ دیکھ کر حضرت علی اکبر فرماتے ہیں۔ "یکساں ہے ہم کو اب سو بھی ہزار بھی" فوج شام تیروں کی بارش کر دیتی ہے۔ آپ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ شاعر اس موقعہ پر لکھتا ہے

نرغے میں ان کی تیغ بھی پھرتی تھی ہر طرف
بجلی سی کوند کوند کے گرتی تھی ہر طرف

اس طرف جناب امام حسین خیمہ عصمت میں اپنے فرزند دلبند حضرت علی اکبر کا ذکر فرما رہے ہیں ناگاہ فوج شام سے نعرہ مسرت بلند ہوا۔ اور ساتھ ہی حضرت علی اکبر کے پکارنے کی بھی آواز آتی ہے مخدرات عظام بے اختیار ہو جاتی ہیں جناب امام حسین مختصر الفاظ میں تلقین صبر فرما کر حضرت علی اکبر کے قریب پہنچتے ہیں۔ اور

بے اختیار فرماتے ہیں:۔

اٹھارھواں برس تھا کچھ ایسے سن نہ تھے
اے نوجوان ابھی تیرے مرنے کے دن نہ تھے

جناب امام مجروح فرزند کو آغوش میں لیے حرم میں تشریف لائے حضرت شہر بانو (حضرت علی اکبر کی والدہ محترمہ) مجسمہ درد و غم بنی ہوئی بیٹے کے آخری دیدار کے لئے بیقرار ہیں۔

آیا نظر جو لاشہ فرزند تشنہ کام — رو کر پچھاڑیں کھانے لگی بانوئے امام
چلائی بڑھ کے خواہر شاہ فلک مقام — کیوں بھائی کیا گذر گیا ہے ہر یہ لالہ فام
شہ بولے میہمان بس اب کوئی دم کے ہیں
جلد ان کو دیکھ لو یہ مسافر عدم کے ہیں

حضرت شہر بانو بیٹے کو آلودہ خاک و خوں دیکھ کر کس حسرت سے فرماتی ہیں

اماں نثار کیا رُخ پُر خوں یہ نور ہے
بیٹا غضب لڑے کہ بدن چور چور ہے

حضرت علی اکبر پر عالم نزع طاری ہے۔ لیکن نگاہیں ماں کے چہرے پر لگی ہوئی ہیں، شاعر اس موقع پر کہتا ہے۔

رگ رگ سے دم نکلنے کے صدمے گذر گئے
مُنہ تکتے تکتے اکبرِ مظلوم مر گئے

مرگِ فرزند

دشمن سے بھی اللہ چھڑائے نہ پسر کو
تقدیر نہ دنیا میں اُجاڑے کسی گھر کو
کر دیتا ہے ناسور یہ غم دل کو جگر کو
مادر کو قرار آتا ہے اکدم نہ پدر کو
جینے کی حلاوت کسی عنوان نہیں رہتی
ماں باپ کے قالب میں غرض جان نہیں رہتی

جب گھر کا چراغ آنکھوں سے پیری میں نہاں ہو
اندھیر نہ کیوں باپ کی نظروں میں جہاں ہو
پھر خاک ہے جسوقت جُدا جسم سے جاں ہو
مخصوص وہ فرزند جو خوش رو ہو جواں ہو
غم ہوتا ہے جو بچہ بھی دنیا سے گذر جائے
کیا سخت یہ ماتم ہے جواں ہو کے جو مر جائے

غمِ فرزند

گھبرائے ہوئے دوڑے گئے جانبِ میداں
فریاد کناں خاک بسر چاک گریباں
اشک آنکھوں میں اُمڈے ہوئے مضطر دل و جاں
لب خشک علم ہاتھ میں تیغ شر رافشاں
ہر گام پہ گرتے تھے یہ طاقت میں کمی تھی
لرزاں تھا بدن گیسوؤں پر خاک جمی تھی

باوفا گھوڑا اپنے راکب کو مجروح پاکر جنگل کی طرف نکال لے گیا تھا۔ جناب امام میدانِ کارزار میں ہر طرف فرزند کو تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن جب اس طرف کہیں نہ ملے۔ تو

محاکات

میداں سے پھر جانبِ صحرا گئے شبیر
فرزند ہلا دشت میں با حالتِ تغیر

ٹکڑے بدن اور غرق بخوں چاند سی تصویر ہونٹوں پہ زباں خشک وہ گیسوئے گرہ گیر
بند آنکھیں تھیں سر ضربت شمشیر سے شق تھا
گلبرگ سے لب خشک تھے چہرے پہ عرق تھا

شہ لاشۂ فرزند سے لپٹے بدلِ زار بوسے لئے اور رکھدیا رخسار پہ رخسار
ٹپکے رُخ گلگوں پہ جو اشک شہِ ابرار نرگس کی طرح کھول دیا آنکھوں کو اکبار
نالان و طپاں سرورِ دلگیر کو دیکھا
حسرت کی نظر سے رُخِ شبیّر کو دیکھا

شہ نے کہا روحی بفداک لے علی اکبرؓ تیغوں سے بہت جسم ہے چاک اے علی اکبرؓ
تم سامنے ہوتے ہو ہلاک اے علی اکبرؓ ہم جیتے ہیں اس جینے پہ خاک اے علی اکبرؓ
مجبور ہیں کچھ زور بھی چلتا نہیں بیٹا
ناچار ہیں دم تن سے نکلتا نہیں بیٹا

حضرت علی اکبر کچھ بولنا چاہتے ہیں-لیکن قوت گفتار جواب دے چکی ہے-آپ ایک نگاہِ حسرت سے دیکھتے ہیں اور جاں سپرد جاں آفریں کر دیتے ہیں

مرگِ فرزند

بدتر ہے گھر لحد سے جو رشکِ قمر چھٹا دنیا ہے پھر سیاہ جو نورِ نظر چھٹا
ٹوٹی کمر جو باپ سے پیارا پسر چھٹا اس سے قرار و صبر چھٹا اس سے گھر چھٹا
ایسی چھُری چلی کہ جگر چاک ہوگیا
موت آئی زندگی کا مزا خاک ہوگیا

مرگ فرزند کے سلسلۂ بیان میں حضرت امام کی حالتِ الم کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

آنکھوں کے آگے خاک پہ بیٹے کی لاش ہو
یہ دکھ پہاڑ پر جو پڑے پاش پاش ہو

اب یہاں سے حضرت علی اکبرؓ کے واقعاتِ شہادت کا آغاز ہوتا ہے۔

واقعہ نگاری

تصویرِ دردِ یاس ہیں تقریر کیا کریں   تھمتا نہیں جگر شہِ دلگیر کیا کریں
تقدیر میں فراق ہے تدبیر کیا کریں   بیٹا جواں بچھڑتا ہے شبیرؑ کیا کریں

خوشرو ہے بےمثال ہے صاحب جمال ہے
اللہ کی پناہ برابر کا لال ہے

جناب امام حسین علیہ السّلام فرزند کو آمادۂ شہادت دیکھ کر خدا کی جناب میں اس طرح طلب صبر و ضبط کرتے ہیں

طلبِ محویّت و صبر

یہ محو ہوں کہ رنجِ فراقِ پسر نہ ہو   برچھی یہ دل پہ کھائے تو دردِ جگر نہ ہو
دکھلائے خشک لب تو مری چشم تر نہ ہو   توڑے یہ جو دم تڑپ کے تو مجھ کو خبر نہ ہو

جس میں تری خوشی ہو زباں سے وہ کام لوں
جب یہ مجھے پکارے تو میں تیرا نام لوں

شوقِ شہادت

صورت یہ شاہ کی علی اکبرؓ کا ہے یہ حال   ماں کی نہ کچھ خبر نہ پھوپھی کا ہے کچھ خیال

گر ہے تو شوقِ تیغ زنی حسرتِ جدال چہرہ ہے سرخ کھلتے ہیں بل گیسوؤں کے بال
بڑھ سکتے ہیں نہ روک ہی سکتے ہیں فوج کو
ہر بار تن کے شیر سا تکتے ہیں فوج کو

جناب امام حسین علیہ السلام فرزند کو شوقِ شہادت میں بیتاب و بیقرار دیکھ رہے ہیں۔ لیکن چاہتے ہیں۔ کہ کسی طرح علی اکبرؓ رک جائیں۔ اور اس موقع کو ٹال دیتے ہیں۔ اور خود جسم اطہر پر سلاحِ جنگ آراستہ کرتے ہیں، یہ دیکھکر حضرت علی اکبرؓ ضبط نہیں کر سکتے۔ عرض کرتے ہیں۔ کہ خانہ زاد اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھ سکتا۔ آپ میدانِ جنگ میں تشریف لے جائیں۔ اسی سلسلۂ بیان میں کہتے ہیں۔ کہ

دنیا میں جب یہ گود کا پالا نہ ہوئیگا
اس وقت کوئی روکنے والا نہ ہوئیگا

فرمایا شاہ نے تمہیں ہم رن میں بھیجدیں پیارے پسر کو لشکرِ دشمن میں بھیجدیں
چھاتی پہ جو پلا ہو اُسے رن میں بھیجدیں گھر کا چراغ دشت کے دامن میں بھیجدیں
میرے لئے ہی موت تمہیں شوقِ جنگ ہے
اچھا بتاؤ باپ کا دل ہے کہ سنگ ہے

حضرت امام حسین علیہ السلام پر فرزند کی جدائی حد درجہ شاق ہے۔ اس موقعہ پر شاعر کہتا ہے۔ کہ

گر پنکھڑی ہوا سے کوئی گل کی جھڑ گئی
بلبل یہ جانتی ہے کہ دنیا اُجڑ گئی

آخر فرزند کے اصرار سے مجبور ہو کر جناب امام اجازت دے دیتے ہیں حضرت

علی اکبر مخدرات عظام کیخدمت میں حصول اجازت کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں۔ آپ کی والدہ حضرت شہر بانو آپ کی پھوپھی حضرت زینب آپ کو دیکھ کر اس طرح دعائیں دیتی ہیں۔

دنیا ہو اور تم ہو محمدؐ کا لال ہو
پھولو پھلو جہاں میں تو اماں نہال ہو

حضرت علی اکبرؑ عرض حال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سب میرے بھائیوں کو سبکدوش کر دیا
مجھ کو تو موت نے بھی فراموش کر دیا

پھوپھی اور ماں اجازتِ جنگ نہیں دیتیں۔ آپ جوشِ غم و غیرت میں عرض کرتے ہیں:

قاتل ہمیں دکھاتے ہیں تلواریں تول کے
ارشاد ہو تو پھینکدیں ہتھیار کھول کے

آخر یہاں سے بھی اجازت ملگئی۔ حضرت علی اکبر میدانِ کارزار میں پہنچے۔ آپ کی ہیبت و جلال دیکھکر دشمنوں کا یہ عالم ہوا۔ کہ قدم آگے نہ بڑھا سکے۔ حضرت علی اکبر ارشاد فرماتے ہیں۔

شوقِ جنگ

باجے بجیں نقیب صدا دیں علم بڑھیں
اک اک نہ بڑھ سکیں تو رسالے بہم بڑھیں
تیغوں کے دم بڑھیں فرسونکے قدم بڑھیں
کیا دیر ہے اُدھر سے بڑھو تم تو ہم بڑھیں
چھینٹیں اُڑیں لہو کی دلیروں کا دل بڑھے
ہاتھ آئے کچھ شکار تو شیروں کا دل بڑھے

حملے ہوں بار بار چلیں وار دمبدم ڈوبیں لہو میں نیزہ خونخوار دمبدم
آنکھوں میں چمکے برقِ شرر بار دمیدم کانوں میں آئے تیغوں کی جھنکار دمیدم
آنکھیں ہوں سُرخ زخم بدن پر بھلے لگیں
مقتل ہو عید گاہ تو خنجر گلے لگیں

پھر اس طرح رجز خواں ہوتے ہیں

ہم پنجہ ہو یہ تاب بھلا کب دلیر کو
پکڑیں کلائیاں تو کچل ڈالیں شیر کو

جنگ شروع ہوتی ہے۔ حضرت علی اکبر کی تیغ آزمائی ملاحظہ ہو

معرکہ آرائی

سن سے چلی جو تیغ سمٹنے لگے پرے مثلِ ورق ہوا سے الٹنے لگے پرے
اک دو قدم بڑھے تھے کہ گھٹنے لگے پرے سطر غلط کی طرح سے کٹنے لگے پرے
سب روسیاہ خوف سے مستور ہو گئے
سر کیا اڑے کہ نقطۂ شک دور ہو گئے
کٹ کٹ کے پھر تو سر یہ سر اور تن پہ تن گرا چمکی جو تیغ سہم کے ناوک فگن گرا
روئیں تن اس طرف تو ادھر صف شکن گرا وہ نیزہ باز مر گیا یہ تیغ زن گرا
مُنہ پر پڑا اجل کا طمانچہ جہاں گئے
ثابت نہ تھا کہ گرز کے ٹکڑے کہاں گئے

حضرت علی اکبر کی شمشیر خار اشگاف نے دشمنوں کا یہ حال کر دیا۔ کہ

مغفر کہاں کے دوش پہ سرِ یار ہو گئے
چار آئینہ گرے ہوئے دیوار ہو گئے

اور اس وقت منظر ایسا تھا کہ

گلرنگ تھے طیور ہوا سُرخ پوش تھی
مقتل کی سب زمین شَید گلفروش تھی

حضرت علی اکبر کو دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ وار پر وار ہو رہا ہے۔ لیکن آپ ایسی بے پروائی کے ساتھ جواب دے رہے ہیں۔ گویا آپ کو کچھ اندیشہ ہی نہیں ہے۔ شاعر اس موقع پر کہتا ہے۔ کہ

فانوس بنکے آپ حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

دیر تک مصروفِ جنگ رہنے کے بعد آپ مجروح ہو جاتے ہیں۔ اور اب ہر طرف سے کاری ضربیں پڑ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ آپ ضعف و تشنگی سے بیحال ہو کر گر پڑے۔ اور اسی حالت میں جناب امام کو پکارتے ہیں۔ حضرت سید الصابرین فرزند کی آواز سنتے ہیں۔ اور آپ کی زبانِ مبارک پر بے اختیار یہ الفاظ آ جاتے ہیں۔

ساتھ اسکے بوریا نہ قریب اُسکے تاج و تخت
بر میں گدا و شاہ کے ہوتا ہے ایک رخت

بستی نہ راہ میں نہ کہیں سایۂ درخت
روتے تھے یا یا جان بھی یہ وہ سفر ہے سخت

چھوٹے ہیں جن سے رہتی تھی صحبت جہان میں
احباب کی صدا بھی نہیں آتی ہے کان میں

اس قدر ارشاد فرما کر آپ فرزند کی تلاش میں نکلے۔ وفادار گھوڑا حضرت علی اکبرؓ کو میدان کارزار سے دور نکال لے گیا ہے۔ جناب امامؑ تلاش کرتے ہوئے اسجگہ پہنچے۔ اور فرزند کو اس حالت میں آلودۂ خاک و خوں پایا۔

پلکوں کے رُخ پہ خون کی بوندیں گری ہوئیں
پتھرائی آنکھیں خیمے کی جانب پھری ہوئیں

جناب امام فرزند کو پکارتے ہیں۔ حضرت علی اکبر آنکھیں کھول دیتے ہیں۔ اور جناب امام کیخدمت میں اس طرح عرض کرتے ہیں۔

آئے حضور مل گئی دولت جہان کی
اب کوئی دم میں جسم سے رخصت ہے جان کی

عالمِ نزع

یہ کہتے کہتے آگیا کھنچکر لبوں پہ دم — آیا پسینہ بند ہوئی کُھل کے چشم نم
پھیلائے ہاتھ گاہ سمیٹے کبھی قدم — دو چار ہچکیوں میں سدھارے سوئے عدم
یوں نکلی رُوح جسمِ شبیہ رسول سے
بو جس طرح سحر کو نکلتی ہے پھول سے

جب گلشن ہستی سے سفر کر گئے اکبرؓ — ایام جوانی کے بسر کر گئے اکبرؓ
مرنے کی مہم تھی اسے سر کر گئے اکبرؓ — ویراں شہ مظلوم کا گھر کر گئے اکبرؓ
ماں روتی تھی پردے سے نکالے ہوئے سر کو
میدان میں شہ ڈھونڈتے تھے لاشِ پسر کو

جناب امام فرزند کی تلاش میں ہر طرف متجسس ہیں۔ اس موقعہ پر مرثیہ نگار کہتا ہے۔

مظلوم تو تھے ہوگئے بیکس شہِ دیں اور
رکھتے ہیں کہیں پانوں تو پڑتا ہے کہیں اور

شاعر پھر کہتا ہے۔

قوت تنِ شبیرؑ کی کسطرح نہ گھٹ جائے
جب سامنے آنکھوں کے پسر تیغوں سے کٹ جائے
یہ غم وہ ہے جانکاہ کہ دل زیست سے ہٹ جائے
کچھ دور نہیں غم سے کلیجہ بھی جو پھٹ جائے

اس شخص سے پوچھو یہ الم جس کے ہوجی پر
واللہ فلک ٹوٹ پڑا اس سبطِ نبی پر

الغرض جناب امام لاشۂ فرزند کے قریب پہنچے۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے۔

تھی آنکھوں میں جاں اکبر مجروح جگر کی
جنبش ہوئی پلکوں کو صدا سُن کے پدر کی
کس الفت و حسرت سے رُخ شہ پہ نظر کی
بے حس تھی زباں انکی خبر پوچھی نہ گھر کی

بابا سے وصیت بھی نہ کچھ کر گئے اکبر
رخصت کا اشارہ کیا اور مر گئے اکبر

مرگ فرزند

چھٹا جو شاہ سے پیری میں نوجواں فرزند
حسین خوش قد و خوش رو و خوش بیاں فرزند
رشید و عابد و ذی جاہ و رتبہ داں فرزند
پدر کے تن کی تواں سارے گھر کی جاں فرزند

بہار جس کی نہ دیکھی خزاں وہ باغ ہوا
قیامت آگئی گھر شہ کا بے چراغ ہوا

غمِ فرزند

بدن سے جان چلی جسم تھرتھرانے لگا پسینہ آگیا جی شہ کا سنسنانے لگا
پسر جہاں سے چلا تن سے زور جانے لگا چلے جو رن کو تو ہر گام پر غش آنے لگا
کبھی اوٹھے تو کبھی گر کے آہ بیٹھ گئے
جگر میں درد یہ اُٹھا کہ شاہ بیٹھ گئے

بہار سبزۂ خط کی نہ ہمکو دکھلائی جب آئے پھولنے پھلنے کے دن تو موت آئی
وہ رُخ وہ نرگسی آنکھیں وہ قد کی رعنائی وہ گل سا جسم وہ تن پر قبا کی زیبائی
ہوا نہ بیاہ کہ چھوڑا جہانِ فانی کو
اجل نے لوٹ لیا گلشنِ جوانی کو

اسی سلسلۂ بیان میں ایک بیت ملاحظہ ہو۔ جناب امام غمِ فرزند میں فرماتے ہیں

ہوئی تمام نہ منزل کہ ہاتھ چھوڑ دیا
ضعیف باپ کا جنگل میں ساتھ چھوڑ دیا

جناب امام فرزند کو ہر طرف تلاش کر رہے ہیں۔ یکایک آواز آئی۔ ع

اجل قریب ہے رخصت غلام ہوتا ہے

جناب امام فرزند کی آواز خریں سُنکر تڑپ جاتے ہیں۔ جب قریب جاتے ہیں۔ تو فرزند کو اس حال میں دیکھتے ہیں۔

زباں ہی ہونٹو نپہ ہنگام دم شماری ہے گلے سے اور کلیجے سے خون جاری ہے

آپ فرزند کو آغوش میں لیکر ہشیار کرتے ہیں۔ حضرت علی اکبر آنکھ کھول کر دیکھتے ہیں۔ اور رُوح پرواز کر جاتی ہے۔

میر نفیس

اُس مَے کا ہوں نوشندہ کہ مستی نہیں جسمیں
حاصل وہ بلندی ہے کہ پستی نہیں جسمیں
آوارہ صحرا ہوں کہ ہستی نہیں جسمیں
اس ملک میں بستا ہوں کہ بستی نہیں جسمیں
رنجش نہیں کھٹکا نہیں آزار نہیں ہے
اس باغ کا بلبل ہوں جہاں خار نہیں ہے

سرگشتۂ و شیدائے محبت ہوں ازل سے
آلودۂ رنج و غم و محنت ہوں ازل سے
باشندۂ ویرانۂ زحمت ہوں ازل سے
مستغرق دریائے مصیبت ہوں ازل سے
سب روئے ہیں جب میں نے دم سرد بھرا ہے
رگ رگ میں مری خوں کی عوض درد بھرا ہے

وحشت دلِ عالم کو ہے ویرانے سے میرے
آرام زمیں کو نہیں گھبرانے سے میرے
راحت سے کوئی دل نہیں غم کھانے سے میرے
بلبل کا جگر چاک ہے چلّانے سے میرے
وہ کون سے گل ہیں جو پریشاں نہیں ہوتے
غنچے بھی مجھے دیکھ کے خنداں نہیں ہوتے

یارب مرے ممدوح کو تو مجھ کو دکھا دے
ضو جسکی قمر میں ہے وہ رُو مجھکو دکھا دے
جس سینے میں جنت کی ہے بو مجھکو دکھا دے
خنجر سے کٹا جو وہ گلو مجھ کو دکھا دے


میر نفیس لکھنوی

در بارِ شہنشاہِ الوالعزم میں پہنچوں
آنکھوں کو بچھاؤں میں جو اس بزم میں پہنچوں

یہاں سے مرثیہ نگار واقعہ روزِ عاشورہ بیان کرتا ہے۔ جناب امام حسین علیہ السّلام کے تمام عزیز و رفیق کام آچکے ہیں۔ اب آپ خود آمادۂ شہادت ہیں۔ حضرت علی اکبر کا اصرار ہے۔ کہ انہیں قدموں پر نثار ہونیکی اجازت دی جائے۔ آخر فرزند کے اصرار پیہم سے مجبور ہو کر

شہ نے کہا خیر اب ہمیں رو کر نہ رلاؤ — اچھا یہی مرضی جو تمہاری ہے تو جاؤ
گھر میں چلو ماں بہنوں سے پھپھیوں سے مل آؤ — اس عالمِ تنہائی میں داغ اپنا دکھاؤ
پہلے ہمیں سر اپنا کٹانے نہیں دیتے
مجبور ہیں تم مرنے کو جانے نہیں دیتے

ماں کا جذبۂ محبّت

یہ سنتے ہی خیمہ میں وہ عالی گہر آیا — ثابت یہ ہوا برج شرف میں قمر آیا
مادر کو جو فرزند کا چہرہ نظر آیا — ہاتھوں کو تو پھیلا دیا دل غم سے بھر آیا
ہوش اپنا نہ تھا دھیان میں اُس ماہِ لقا کے
رونے لگی آنچل سے وہ چہرے کو چھپا کے

حضرت علی اکبر رضؑ اپنا عزم بیان کرتے ہوئے اپنی والدہ اور پھوپھی حضرت زینب سے اس طرح عرض کرتے ہیں۔

آفت ہے اگر سیّدِ والا نہ رکینگے
روکوگی اگر ہم کو تو بابا نہ رکینگے

واقعہ نگاری

دل ہلگیا بانو کا یہ بیٹے نے کہا جب مظلومیٔ شبیّر پہ رونے لگیں زینب

ہاتھوں سے جگر تھام کے اکبر سے کہا تب صدقے گئی سمجھی میں جو ہے آپکا مطلب

غازی ہو مددگار شہِ عرش نشیں ہو

اب مجھ پہ کھُلا عازمِ فردوسِ بریں ہو

الغرض بڑی کوشش و کاوش کے بعد حضرت علی اکبر کو اجازتِ وغا ملی۔

آپ سب سے آخری رخصت کے بعد سمندِ صبا رفتار پر سوار ہو کر عازم میدانِ کارزار ہوئے۔ گھوڑے کے سلسلۂ تعریف میں شاعر کہتا ہے۔ کہ

یوں اُڑ کے ہوا جلوہ نُما ظلم کے بن میں

جس طرح کہ طاؤس اُترتا ہے چمن میں

شاعر حضرت علی اکبر کی سطوت و شوکت، حسن و جمال کا بیان ان لفظوں میں کرتا ہے۔

وہ دبدبہ وہ شوکتِ شہزادۂ ذیقدر یہ چاند ہے اُس کا کہ جو ہے فاطمہ کا بدر

آئینہ و خورشید و قمر دوش و بر و صدر جرات وہ کہ آشوب کا ڈر نے خطر غدر

جانوں یہ نہ کس طرح بنے بے ادبوں کی

سینوں میں جگر ہلتے ہیں جنبش سے لبوں کی

فوج کی آمادگی جنگ کا نقشہ شاعر اس طرح کھینچتا ہے۔

آمادگی جنگ

وہ غل دہل جنگ کا باجے وہ عرب کے وہ شور دف و سنج کہ دل ہلتے تھے سب کے

وہ نے کی صدا بوق کے نالے وہ غضب کے جنگل کے اسد بھاگ گئے خوف سے دب کے
حیران تھے ہرن کوہ کے دامن سے نکل کے
اڑنے لگے طائر بھی نشیمن سے نکل کے

بڑھتے چلے آتے ہیں سواروں کے رسالے سب برچھیاں اونچی کئے ہیں برچھیوں والے
خنجر ہیں دودھارے علم اور ہلتے ہیں بھالے سارے قدر انداز کمانیں ہیں سنبھالے
سب فوج کا رُخ شاہ کے دلبر کی طرف ہے
تنہائی جگر گوشہ سرور کی طرف ہے

واقعہ نگاری

ہر صف کے قریں آتی ہیں پانی کی پکھالیں ہے شور جو پیاسے ہوں وہ پیاس اپنی بجھالیں
سیراب جو ہولیں تو ہوس دل کی نکالیں پیتے ہیں بعیں سامنے رو کے ہوئے ڈھالیں
دو روز سے عالم ہے ادھر تشنہ لبی کا
چلتا ہے جگر پیاس سے ہمشکل نبی کا

حضرت علی اکبر دشمنوں کی کثرت اور آمادگیٔ جنگ دیکھکر اس طرح رجز خوانی کرتے ہیں۔

رجز

رن سے اسد اللہ کے پیارے نہیں ہٹتے گردوں پہ جو ثابت ہیں ستارے نہیں ہٹتے
اشرار کو بیجان سے مارے نہیں ہٹتے بڑھتے ہیں تو پھر پاؤں ہمارے نہیں ہٹتے
دے جن کو خدا اوج وہ جھکتے ہیں کسی سے؟
بہتے ہوئے دریا کہیں رکتے ہیں کسی سے؟

اے دست و قلم حرب کا نقشہ بہ ادب کھینچ
جو شکل کسی سے نہ کھنچی ہوئے وہ اب کھینچ
ہاں صورتِ قہر و غضب ضیغم رب کھینچ
تصویر جدال پسرِ شاہِ عرب کھینچ
رنگِ رُخ بہرام فلک خوف سے فق ہو
ہر بند لڑائی کے مرقع کا ورق ہو

نقشۂ جنگ

واں برچھیاں دو لاکھ برابر سے اُٹھی ہیں
نیزوں کی سنانیں سپہ شر سے اُٹھی ہیں
تلواریں علم ہیں سپریں سر سے اُٹھی ہیں
گھنگور گھٹائیں ہیں کہ لشکر سے اُٹھی ہیں
منہ کھولے ہیں لشکر کے دلاور جو بڑے ہیں
کھینچے ہوئے چلّے قدر انداز کھڑے ہیں

جنگ شروع ہوتی ہے۔ حضرت علی اکبر کی تیغ آزمائی ملاحظہ ہو۔

تلوار کی صفائی

گرنے لگے سرہنگوں کے سر تن سی چلی تیغ
تا سینہ اُتر آئی جو گردن سے چلی تیغ
ہاتھ اُڑ گئے جب مثلِ ہوا سن سی چلی تیغ
بد ظن ہوئے بیجان جد ہر زن سے چلی تیغ
نے ہاتھوں میں حربے تھے نہ جانیں تھیں بدن میں
آخر صفِ اوّل ہوئی اک چشم زدن میں

تلوار کی تعریف میں شاعرانہ مبالغہ ملاحظہ ہو۔

لـه "ہو" کی جگہ ہوئے یا ہووے۔ اب متروک ہے۔ ٢ـه شاہِ عرب سے مراد حضرت امام حسین اور پسر شاہ عرب سے حضرت علی اکبر۔

تلوار کی تعریف

ابر ایسا کہ سب خوں میں شرابور ہوئے تھے طاقت میں جو افزوں تھی وہ کمزور ہوئے تھے
گھاٹ ایسا کہ زندے بھی لب گور ہوئے تھے تابندگی ایسی کہ شقی کور ہوئے تھے
کیا دیکھتے کاٹ اس کا لعیں لشکر شر کے
وہ تیغ اڑا دیتی تھی پر مرغِ نظر کے
کھا جاتی تھی فولاد کو وہ تیغ بلا پوش روپوش ہوئے جاتے تھی ڈر ڈر کے زرہ پوش
سر تیز و شرر ریز و گرانقدر و سبکدوش چلتی تھی زباں جنگ میں یوں دیکھو تو خاموش
انداز نیا رنگ نیا گھاٹ نیا تھا
جو وار تھا اعدا کے لئے برق بنا تھا
اک وار میں ہاتھ اڑ گیا جس کی سپر اٹھی پھل بیچ سے دو تھا کوئی تلوار گر اٹھی
منہ کھولے ہوئے آئی تو پھر خوں میں تر اٹھی کس قہر کی بجلی تھی گری یہاں ادھر اٹھی
جل جل کے صفِ فوج سر کتی نظر آئی
بن پھکنے لگا آگ بھڑکتی نظر آئی

نقشۂ جنگ

بیدم تھا کوئی خوں میں کوئی تر بسرِ خاک بازو کہیں ٹکڑے کہیں پیکر بسرِ خاک
یہاں ہاتھ ادھر پاؤں ادھر سر بسرِ خاک کشتے جو تڑپتے تھے برابر بسرِ خاک
ہنستی تھی اجل بانیٔ شر لوٹ رہے تھے
یہ اور تماشہ ہے کہ سر لوٹ رہے تھے
یوں ہوتا تھا اس تیغ سے میدانِ بلا صاف جس طرح سے کر دیتی ہے جنگل کو ہوا صاف

چلتی تھی زباں جب تو یہ آتی تھی صدا صاف
رہتی ہوں بکدر جو نہو دشت و غاصاف

انصاف مرا اور لڑائی مری دیکھی
کیوں کینہ دلو تم نے صفائی مری دیکھی

فوجِ غنیم ہزیمت خوردہ فرار پر آمادہ تھی۔ لیکن

تاکیدِ ابن سعد سے لشکر سمٹ آیا
کس قہر کا تھا ابر کہ اس چاند پہ چھایا
جلاّدوں سے گوشہ کہیں بچنے کا نہ پایا
تقدیر نے سامان شہادت کا دکھایا
قاتل تھے چپ و راست جو غصے میں بھرے تھے
اور سامنے سب برچھیوں والوں کے پرے تھے

خیمہ سے جناب امام حسین علیہ السّلام فرزند کو نرغۂ اعدا میں دیکھ کر مدد کے لئے بڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھکر علی اکبر اصرار کے ساتھ روکتے ہیں۔

دل تھام کے یاں روتے لگے حضرتِ شبیر
ہمشکل پیمبر پہ برسنے لگے واں تیر
نزدیک سے پڑنے لگی شمشیر پہ شمشیر
فریاد ہے وہ برچھیاں اور اکبرِ دلگیر
کیا دل تھا کہ بلوے سے نہ گھبراتے تھے اکبر
نوکیں تھیں سنانوں کی جدھر جاتے تھے اکبر

اور یہ عالم تھا۔ کہ

پہلو ہوئے مجروح جدھر باگ کو پھیرا
ہر زخم پہ آجاتا تھا آنکھوں میں اندھیرا

ناگاہ اسی حالت میں۔

دو صدمۂ تازہ ہوئے اس رشک قمر پر
اک دل پہ سناں چل گئی اور ایک جگر پر

ا۔ یہاں کی بجائے "یاں" اب متروک ہے ۲۔ و ۳۔ مراد حضرت علی اکبر

حضرت علی اکبر سنبھلنے نہ پائے تھے۔ کہ سر مبارک زخمی ہوا۔ شاعر اسموقعہ پر کہتا ہو کہ

دنیا ہوئی تیرہ نظرِ تشنہ گلو میں

تر ہو گئے سب چاند سے رخسار لہو میں

حضرت علی اکبر رضا گرتے ہوئے جناب امام کو آواز دیتے ہیں آپ آواز سنکر بیقرار ہو جاتے ہیں۔ اور مخدرات عظام کو مخاطب کر کے تلقین صبر فرماتے ہیں۔ اس کے بعد فرزند کو تلاش کرتے ہوئے میدان قتلگاہ میں پہنچتے ہیں

واقعہ نگاری

آپہنچے قرین لاش ہے حبیب سیّد ابرار رُعبِ شہِ ذیشاں سے ہٹی فوجِ ستمگار

جھک کر جو نظر کی طرفِ لاشۂ دلدار کی آہ اک ایسی کہ ہلا گنبدِ دوّار

بہتا ہوا خوں جسم خوش اقبال سے دیکھا

آغوش کے پالے کو عجب حال سے دیکھا

پیشانی پہ مُنہ رکھ کے یہ شبّیر پکارے صدقے یہ پدر خوں بھرے چہرے کے تمہارے

اے لختِ دل اے زینبِ ذیجاہ کے پیارے آواز دو جیتے ہو کہ دنیا سے سدھارے

لب بند ہیں آنکھیں بھی نہیں کھولتے بیٹا

ہم آئے تو اب منہ سے نہیں بولتے بیٹا

سُنکر یہ صدا ہوش میں آیا وہ گل اندام لینے نہ دیا دردِ جگر نے مگر آرام

کس یاس سے دیکھا طرف شاہِ خوش انجام مجروح جو تھے گوشۂ چشمانِ سیہ فام

صدمہ ہوا آنسو رُخ انور پہ ڈھل آئے

قطرے کئی آنکھوں سے لہو کے نکل آئے

کی عرض کہ خلقت سے نفس سہم جاتے ہیں بابا
دل زخمی ہے غش پر ہمیں غش آتے ہیں بابا
مرنے سے نہ مضطر ہیں نہ گھبراتے ہیں بابا
ہاں آپ کی تنہائی کا غم کھاتے ہیں بابا

جو سینہ سپر تھے وہ مددگار نہیں ہیں
دشمن تو ہزاروں ہیں اکیلے شہِ دیں ہیں

یہ کہکے جو روئے تو کلیجے میں اٹھا درد
بند آنکھیں ہوئیں چہرۂ پُر نور ہوا زرد
لیں ہچکیاں تھرّانے لگے بازوئے پُر گرد
گلرنگ سے لب ہل گئے کھینچا نفس سرد

دی جان تڑپ کر شہِ دلگیر کے آگے
فرزندِ جواں مر گیا شبیر کے آگے

رخصت ہے پدر سے علی اکبر سے جواں کی
اب لٹتی ہے تصویر رسولؐ دو جہاں کی
آمد ہے گلستانِ جوانی پہ خزاں کی
رحلت چمنِ شاہ سے ہے سرو رواں کی

اٹھارھواں ہے سال نہ پھولے نہ پھلے ہیں
شادی کے دن آئے ہیں تو مرنے کو چلے ہیں

مرثیہ نگار جناب امام حسین کے صدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

سب سچ ہے جو کچھ حال ہو مظلوم پدر کا
یہ اور مصیبت نہیں مرنا ہے پسر کا

اسی سلسلۂ بیان میں پھر کہتا ہے۔

مرگ فرزند

عسرت کا جو ہو درد تو زر اس کی دوا ہے
مہلک بھی ہو آزار تو امیدِ شفا ہے

جس دکھ کا مداوا نہیں دنیا میں وہ کیا ہو — اندوہ فراقِ پسرِ ماہ لقا ہے

یہ غم پدرِ بیکس و بے یار سے پوچھو
اس درد کو زخمی کے دلِ زار سے پوچھو

ایک بیت اور ملاحظہ ہو

یہ آگ نہ دشمن کے کلیجے کو جلائے
شعلہ یہ وہی ہے جسے دریا نہ بجھائے

اسی مضمون کے سلسلہ میں ایک بند نہایت نادر کہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

غمِ اولاد

طائر کے بھی بچے کو پکڑتا ہے جو صیّاد — پیچھے وہ چلا جاتا ہے کرتا ہوا فریاد
احرار ہوا بھی نہیں اس رنج سے آزاد — ناسور کلیجے کے لئے ہے غمِ اولاد
آواز ہے پتّوں کی نشاں نوحہ گری کا
ہوتا ہے درختوں کو بھی غم بے ثمری کا

شاعر اصل واقعہ کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے۔ کہ جناب امام حضرت علی اکبر کو اذنِ وغا دیتے ہوئے بارگاہ احدیت میں عرض کرتے ہیں۔

دنیا میں بس اب دولتِ شبیر یہی ہے
یارب تیرے محبوب کی تصویر یہی ہے

لیکن ہجوم غم سے یہ عالم ہے۔ کہ

پٹکا ابھی باندھا نہیں محبوب پسر نے
خم کر دیا ہے شہ[۱] کو یہاں دردِ کمر نے

[۱] یعنی جناب امام حسین

جب کہتی ہے ماں[1] گود میری ہوتی ہے خالی
اُڑ جاتی ہے اندوہ سے رخساروں کی لالی
فرماتے ہیں فرزند سے رو کر شہ[3] عالی
کیا دور ہے مرجائے اگر پالنے والی
اندھیر ہے دنیا شہ[5] والا کی نظر میں
بجھتی نہیں جو آگ وہ بھڑکی ہے جگر میں

اس قدر ارشاد فرما کر جناب امام باہر تشریف لے آئے۔ ساتھ ہی حضرت علی اکبرؓ بھی حاضر ہوئے اور اس طرح عرض پرداز ہیں کہ اب غلام کو نہ روکئے۔ دشمن طعنہ زن ہیں کہ اب حسین کا کوئی جاں نثار نہیں۔ یہ کہتے کہتے حضرت علی اکبر جوشِ غضب میں بھر جاتے ہیں بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں۔

کیا سینہ سپر ہونے کو ہم پاس نہیں ہیں
اکبر تو ہے گر حضرت عباس نہیں ہیں

پھر عرض کرتے ہیں۔

قابو میں نہیں ہے دل و جاں جوشِ غضب سے
روکا ہے جو ہاتھوں کو تو حضرت کے ادب سے

جناب امام جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

انصاف سے دو اس کا جواب اپنے پدر کو
رکھتا ہے کوئی سامنے تیغوں کے جگر کو
اولاد بچے گر تو لٹا دیتے ہیں گھر کو
بھیجا ہے کسی باپ نے تیغوں میں پسر کو
آنکھوں کی بصارت کو گنوایا ہے کسی نے
ہاتھوں سے چراغ اپنا بجھایا ہے کسی نے

[1] حضرت شہر بانو [2] حضرت علی اکبر کے متعلق اشارہ ہے [3] و [5] جناب امام حسین

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر شوقِ شہادت ہے تو ہمارے شہید ہونے تک توقف کرو۔ اسی سلسلۂ بیان میں یہ بیت نہایت دردناک ہے۔

جانا سوئے فردوس بریں برچھیاں کھا کر
پھر تم کو نہ روئے گا کوئی قبر سے آکر

یہاں یہ گفتگو تھی۔ کہ فوجِ شام سے نعرۂ ھل من مبارز بلند ہوتا ہے۔ اور حضرت علی اکبر کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے۔ ؎

لڑنے کو جو کوئی نہیں آتا تو ہم آئیں

محاکات

یہ سنتے ہی برہم ہوا شہزادۂ عالم ‏ غیظ آگیا بل کھانے لگے گیسوئے پُرخم
مُنہ لال ہوا سُرخ ہوئے دیدۂ پُرنم ‏ اعدا کی طرف بڑھ گئے رُک کے صورتِ ضیغم
حیدر کی طرح لشکرِ بے پیر کو دیکھا
شمشیر کو دیکھا رُخِ شبیرؑ کو دیکھا

لیکن

مانع تھا ادب جا نہ سکے فوجِ ستم پر
تلوار لئے گر پڑے حضرتؑ کے قدم پر

آخر مجبور ہو کر جناب اجازت عطا فرماتے ہیں۔ اور ارشاد ہوتا ہے۔ کہ حرم میں جا کر رخصت ہو آؤ حضرت علی اکبر داخل خیمہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ایک بیت ملاحظہ ہو۔

یوں آیا وہ گلگونِ حرم شاہِ زمنؑ میں
گویا کہ بہار آگئی پژمردہ چمن میں

حضرت علی اکبر کو دیکھ کر آپ کی والدہ حضرت شہر بانو بیقرار ہو گئیں۔ اور آپ کی پھوپھی حضرت زینب اس طرح ارشاد فرمانے لگیں

ماتم ہے یہاں صبح سے اور گریہ و زاری دُکھ درد میں گھر کی بھی خبر رکھتے ہیں واری
تشویش سے بانو کو غش آیا کئی باری کچھ تم کو نہیں دھیان محبّت کا ہماری

سمجھے نہ کہ دنیا سے گذر جائیگی زینب
دم بھر جو نہ دیکھے گی تو مر جائیگی زینب

حضرت علی اکبر جواب میں عرض کرتے ہیں۔ کہ

بابا سے ہمیں رن کی اجازت نہ ملی تھی
یہ دیر کا باعث تھا کہ رخصت نہ ملی تھی

پھر کہتے ہیں۔ کہ

مرنے کی اجازت ہوئی حاصل تو ہم آئے راضی ہوئے جب سرورِ عادل تو ہم آئے
خالق کی عنایت ہوئی شامل تو ہم آئے حل ہو گیا یہ عقدۂ مشکل تو ہم آئے

انساں کو عبث دل کا لگانا ہے یہاں سے
جو آیا ہے اک دن اُسے جانا ہے یہاں سے

پھر عرض کرتے ہیں۔ کہ اب صرف آپ سے اور والدہ صاحبہ سے اجازت لینی باقی ہے۔ اور اسی واسطے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سنکر حضرت شہر بانو سکتہ میں آگئیں جناب زینب بھتیجے کی باتوں کے سلسلۂ جواب میں ارشاد فرماتی ہیں

تم خوش ہو کہ ناخوش ہو اجازت نہ ملیگی
میں صاف کہے دیتی ہوں رخصت نہ ملیگی

پھر ارشاد ہوتا ہے :-

ماں اور پھوپھی کا جذبۂ محبّت

دیکھو جو قدم تم نے رکھا خیمہ سے باہر میں بھی چلی آؤنگی وہیں کھولے ہوئے سر
ہر بار نہ لو مرنے کا نام اے سرے دلبر منھ سے نکل آئیگا کلیجا مرا پھٹ کر
ماں باپ سے مُنہ موڑ کے مَرنے کو چلے ہو
کیا خوب ہمیں چھوڑ کے مَرنے کو چلے ہو

مرقع نگاری

یہ ذکر تھا جو خیمے میں داخل ہوئے شبّیر بیٹے کی طرف دیکھ کے دیکھا رُخ ہمشیر
پاس آ کے یہ کہنے لگی تب بانوئے دلگیر صاحب علی اکبر نہیں رُکتے کسی تدبیر
صدقے گئی اِس نخلِ ریاضت کو بچالو
نادار کی لُٹتی ہوئی دولت کو بچالو

پُر درد بیاں

مجبور ہے یہ بیکس و نالاں و پریشاں موت اِن کی طلبگار ہے یہ موت کے خواہاں
کیا کرتا ندیتا انھیں گر رخصتِ میداں قدموں سے اُٹھلتے تھے نہ سر یہ کسی عنواں
تم سے بھی تو آمادہ رخصت طلبی ہیں
پاس آ گیا مجھکو کہ یہ ہمشکلِ نبی ہیں
تیغوں سے بچائیں ہمیں اِن کو ہی یہ منظور سب سہل ہے اچھا ہی تلواروں سے ہوں چور
ہر طرح ہے راضی پدرِ بیکس و مجبور تھوڑا ہی پس و پیش ہے منزل نہیں کچھ دور

سہ لیں گے جو کچھ ظلم و ستم ہونگے جہاں میں

تا عصر نہ یہ ہونگے نہ ہم ہونگے جہاں ہیں

الغرض حضرت علی اکبر سب سے رخصت ہو کر میدانِ وغا کی طرف روانہ ہوئے

شاعر حضرت علی اکبر کے حسن و جمال کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔ کہ

حضرت علی اکبرؓ کا حلیہ

بخشی ہے خدا نے انہیں توقیرِ محمدؐ گیسو ہیں کہ ہے زلف گرہ گیرِ محمدؐ

چہرہ ہے کہ آئینۂ تصویرِ محمدؐ باتوں میں ہے رنگینی تقریرِ محمدؐ

شوکت وہی پوشاک کا دستور وہی ہے

نقشا وہی انداز وہی نور وہی ہے

گیسوئے دل آویز ہیں یا سنبل جنت یہ روئے دل افروز ہے یا صبح صباحت

رخسار ہیں یا جلوۂ آئینۂ قدرت آنکھیں ہیں کہ سر چشمۂ اعجازِ کرامت

طالب نہیں پانی کے حیا مُہرِ دہن ہے

آنکھوں میں پتلی نہیں گھونگھٹ میں دلہن ہے

حضرت علی اکبرؓ میدانِ کارزار میں پہنچکر رجز خوانی کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں

رجز

ہاں سامنے آئے جسے دعوائے وغا ہے قبضہ میں یہ شمشیر نہیں قہر خدا ہے

ہم شیر ہیں دو لاکھ کا لشکر ہے تو کیا ہے جب کھینچ لی تلوار تو ایک ایک فنا ہے

فاقوں کی نہ پروا ہے نہ کچھ تشنہ لبی کی

ہاتھ اس لیے روکا ہے کہ اُمت ہیں نبی کی

مقتل سے بڑھا جب یہ رجز پڑھ کے وہ ضیغم　　تھا رعبِ حق ایسا کہ صفین ہو گئیں برہم
سر اپنے خجالت سے فصیحوں نے کئے خم　　غل تھا کہ زہے قدرتِ خلاقِ دو عالم

یہ سحر بیانی یہ طلاقت نہیں دیکھی
پیاسوں کی زبان میں یہ فصاحت نہیں دیکھی

حضرت علی اکبر مصروفِ جنگ ہوتے ہیں۔ تلوار کی صفائی ملاحظہ ہو۔

معرکہ آرائی

بڑھ بڑھ کے چلی تن سے جو بیداد گروں پر　　نازل ہوئی اک تازہ بلا خیرہ سروں پر
سر خود پہ گرنے لگے اور خود سروں پر　　گرتی تھیں صفیں ڈر کے سواروں کے سروں پر

دس بیس کے سر تن سے جو کٹ جاتے تھے رن میں
گھوڑے بھی الف ہو کے الٹ جاتے تھے رن میں

بالائے زمیں برچھیوں والوں کو گرایا　　ریتی پہ نمودار رسالوں کو گرایا
شانوں سے سبب کار ونکی ڈھالوں کو گرایا　　تنکوں کی طرح کاٹ کے بھالوں کو گرایا

یوں ہاتھ کٹے نخل زبوں چھٹتے ہیں جیسے
یوں کٹ گئے ترکش کہ قلم کٹتے ہیں جیسے

شاعر اس موقع پر حضرت علی اکبر کے ثبات عزم شجاعت و تہور کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

دیتے ہیں نہ ہٹتے ہیں نہ جھکتے ہیں کسی سے
جب رن پہ چڑھے پھر نہیں رکتے ہیں کسی سے

پھر تلوار کی تعریف میں اس طرح کہتا ہے۔

تلوار کی تعریف

یہ تیغ وہ ہے سیلِ فنا کہتے ہیں جس کو یہ برق وہ ہے قہرِ خدا کہتے ہیں جس کو
پارہ اس کی وہ آفت ہے بلا کہتے ہیں جسکو مُنہ اس کا وہ مُنہ ہے کہ قضا کہتے ہیں جسکو

جاتی نہیں بیجان لئے جب آتی ہے سر پر
ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کب آتی ہے سر پر

لیلیٰ وش و دشمن کش و قتال و طرحدار بیدرد و دل آزار زباں آور وطرار
خوش جوہر و سرتیز و کج ابرو و جگر خوار سفاک و جہانگیر و گرانقدر و سبکبار

دو ہو گئی جب ضرب پڑی ڈھال پہ اُسکی
کتنے ہی گلے کٹ گئے اک چال پہ اُسکی

حضرت علی اکبر سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک زبردست پہلوان فوجِ شام سے نکلا۔ اور سامنے آکر اس طرح رجز خوانی کرنے لگا۔

عاجز ہے تہمتن سا دلاور مرے آگے طاقت میں نریماں بھی ہے کمتر مرے آگے
ہے کاہ سے کم کوہ کا لنگر مرے آگے کیا تاب اُٹھائے جو کوئی سر مرے آگے

پھٹتے ہیں جگر رن میں جو چنگھاڑتا ہوں میں
ہلتی ہے زمین نیزے کو جب گاڑتا ہوں میں

حضرت علی اکبر حریف کی یاوہ گوئی کا جواب سخت دیتے ہیں۔ آخر مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت علی اکبر رضنے دشمن کا ہر وار وار رد کر دیا اور اپنے نیزے کا ایک ایسا وار کیا۔ کہ

اس ضرب سے ہونٹوں پہ ستمگار کی جاں تھی
نیزہ دہنِ نحس میں نیزے میں زباں تھی

اور اس کے بعد

گھوڑے کو اوٹھاکر جو دیا اک اُسے جھٹکا نیزے میں وہ مچھلی سا تڑپتا ہوا لٹکا
دم آکے گلے میں ستم ایجاد کا اٹکا جب دے چکے چکر تو زمیں پر اُسے پٹکا

نکلا نہ اُٹھانے کو کوئی فوج ستم سے
گرتے ہوئے دو کردیا شمشیرِ دودم سے

دشمن کو قتل کرنے کے بعد آپ پھر فوج شام سے نبرد آزما ہوئے۔ لیکن خود بھی مجروح ہوئے۔ اس وقت آپ کا یہ عالم تھا۔ کہ

ہرنے[1] پہ کبھی جھک گئے چونکے کبھی غش سے
سینے میں پھنکا جاتا تھا دل فرطِ عطش سے

بیتاب تھا گھوڑے پہ وہ شبیّر کا پیارا جو سینے پہ نیزہ کسی جلاّد نے مارا
چھدنے سے جگر کے نہ رہا ضبط کا یارا تھرّا کے گرا خاک پہ وہ عرش[2] کا تارا

اللہ رے جرأت کہ نہ ابرو پہ بل آیا
نیزے کو جو کھینچا تو کلیجا نکل آیا

حضرت علی اکبرؓ جناب امام کو پکارتے ہیں۔ جناب امام فرزند کی آواز حزیں سُنکر تڑپ جاتے ہیں۔ اور قتلگاہ میں جاکر فرزند کو اس حالت میں دیکھتے ہیں۔ کہ

منہ زرد ہے ہستی کا چمن چھوڑ رہے ہیں
چھاتی سے لہو بہتا ہے دم توڑ رہے ہیں

جناب امام بیتابانہ فرزند کو آغوش میں لے لیتے ہیں، اس کے

[1] زمانہ قدیم میں کاٹھی کے آگے کا حصّہ اونچا ہوتا تھا۔ اسکو ہرنا کہتے ہیں [2] یعنی حضرت علی اکبرؓ

بعد شاعر کہتا ہے۔ کہ

بس گلشن ہستی کے مسافر ہوئے اکبرؓ
منہ دیکھ کے شبیرؑ کا آخر ہوئے اکبرؓ

خوشا مناقب و توقیر اکبر ذیجاہ — چراغ بزم جہاں ابن شاہ عرش پناہ[1]
سپہر عزت و اقبال و اقتدار کے ماہ — نہال باغ ابو طالب[2] و حبیب اللہ[3]

کسی کو خلق میں ایسے شرف حصول کبھی ہیں
بڑھایہ اوج کہ ہم صورت رسول کبھی ہیں

بلند مرتبہ شبیرؑ خوشخصال کے لال — جہاں کے تاج شہنشاہ ذیکمال کے لال
جلیل دُرِّ نجف شیر ذوالجلال کے لال — نبی کی جان کرجاں فاطمہ کے لال کے لال

کسی کو پاک گہر ایسے پرضیا نہ ملے
کسی کو ایسے کبھی لعل بے بہانہ ملے

اسی سلسلۂ بیان میں یہ بیت خوب ہے۔

وہی جبین کشادہ دہان تنگ وہی
وہی ہے پھول سا تن بو وہی ہے رنگ وہی[4]

مناقب حضرت علی اکبرؓ

کرم میں حلم میں مثل نبی وحید زماں — جلال و رعب و تہوّر میں سرور مرداں

[1] مراد حضرت امام حسین کے صاحبزادے [2] حضرت علی کے والد کا نام [3] یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلعم
[4] وہی کا اشارہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔

حسن کا طبع میں خلق اور حسین کا احسان حسین غیور سخی خوش بیاں فصیح زباں

کلام کرتے تھے جب رُوح لطف پاتی تھی

صدائے احمد مختار صاف آتی تھی

واقعاتِ کربلا کے سلسلۂ بیان میں جناب امام عالی مقام اور شبِ دہم کے متعلق شاعر کہتا ہے۔

حضورِ قلب رہا شب بھر ان بلاؤں میں

نمازِ صبح کا وقت آگیا دعاؤں میں

منظرِ صبح کی تصویر کھینچتے ہوئے شاعر یہ بھول جاتا ہے۔ کہ صحرائے کربلا اُس کے پیش نظر ہے۔ یا چمن زارِ کشمیر۔ چنانچہ کہتا ہے۔

منظرِ صبح

پئے صلوٰۃ اُٹھے ہر طرف نماز گذار زمیں پہ چار طرف نور چھا گیا اک بار

چلی نسیم سحر تازہ ہو گئے گلزار ہوائے سرو چلی جھومنے لگے اشجار

چمن کا اور بڑھا رنگ نغمہ خوانوں سے

طیور اُترنے لگے اپنے آشیانوں سے

صبحِ چمن

محیط ہو گئی عالم میں قدرتِ داور وہ آسماں کی صفائی نہ ٹھہری جس پہ نظر

ستارۂ سحری کی چمک وہ گردوں پر وہ آب و تاب ہر اک باغ کی وہ نورِ سحر

چمن کے صحن کو خوشبو سے گل بسانے لگے

طیور ادھر سے ادھر گلشنوں میں جانے لگے

چھار سو وہ ضیا باریاں وہ ضو وہ چمک زمیں کے حسن کو جھک جھک کے دیکھتا تھا فلک
وہ سُرخ و زرد گل تر وہ بوستاں کی مہک وہ اوس کھائے ہوئے سبزہ چمن کی لہک
ضیا دکھانے لگے سب کو داغ لالے کے
سحر کو ہو گئے روشن چراغ لالے کے

ہر ایک پھول تھا خنداں سرور کے مارے بہار صبح کے سب کر رہے تھے نظارے
گل نجوم تو مرجھا کے رہ گئے سارے عیاں تھے قطرۂ شبنم سی خاک پر تارے
زمین پہ نور کی چادر ہزاروں کوس پڑی
بہار شب کی لٹی آسماں پہ اوس پڑی

بلبل و گل کے اظہار تعلق کے سلسلہ میں یہ بیت ملاحظہ ہو۔

بہار اوج پہ تھی نرم نرم پھولوں کی
ہوائے سرد میں صحبت تھی گرم پھولوں کی

منظرِ دریا و صبحِ چمن

وہ آب نہر وہ ایک اک حباب کا جوبن چراغ جلتے ہیں پانی میں بس یہ تھا روشن
وہ نغمہ سنجئ مرغانِ خوش بیانِ چمن نوائے طیر سے اک وجد میں تھا سب گلشن
وہ حسنِ صوت کہ گلچیں بھی دل پکڑتے تھے
زبانِ بلبل شیدا سے پھول جھڑتے تھے

ان مناظر کے قدرتی اثرات تشنہ کامان کربلا پر کیا ہوئے؟ شاعر اسکو اسطرح ظاہر کرتا ہے

دماغ و جسم معطر تھا دل ملولوں کا
نسیم بانٹتی پھرتی تھی عطر پھولوں کا

لیکن ابھی جناب امام فریضہ سحری سے فارغ ہوئے تھے۔ کہ

ہر اک طرف سے شقی و شریر آنے لگے
سحر کے ہوتے ہی خیمہ پہ تیر آنے لگے

جناب امام کے تمام عزیز و رفقا دادِ شجاعت دیتے ہوئے یکے بعد دیگرے شہید ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر شاعر کہتا ہے۔ کہ

قریب ظہر کے سردار بے سپاہ ہوا علی و فاطمہ زہرا کا گھر تباہ ہوا
ستارے چھپ گئے تنہا علی کا ماہ ہوا خزانہ لٹ گیا محتاج بادشاہ ہوا

تمام عمر کی دولت کو کھو چکے شبیرؑ
زوال مہر تلک سب کو رو چکے شبیرؑ

اب صرف حضرت علی اکبر باقی ہیں۔ چنانچہ جناب امام عالیمقام کی خدمت میں اجازت طلب ہوتے ہیں۔ آپ ہر چند روکنا چاہتے ہیں۔ لیکن حضرت علی اکبرؓ نشۂ شہادت میں چور تھے۔ آخر مجبور ہو کر جنابؑ امام نے اجازت عطا فرمائی۔ اور

گلے لگا کے پسر کو دعائیں دینے لگے
حسین سینۂ اکبر کے بوسے لینے لگے

یہ بھر ارشاد ہوا۔ کہ

کسے یقین ہے کہ اب پھر کے گھر میں آؤ گے
نکل پڑینگے حرم سب اگر نہ جاؤ گے

یہ کہکے لیگئے ہمراہ گھر میں جب سرور کمر خمیدہ تھی لب خشک چشم اشکوں سے تر
قریب صحن یہ دیکھا کہ زینبؑ مضطر کھڑی ہیں گریہ کناں ننگے پاؤں ننگے سر

جگر سے کھینچ کے اِک سرد آہ رونے لگے
بہن کے حالِ پریشاں پہ شاہ رونے لگے

الغرض مخدرات عظام سے بھی اجازت حاصل کر کے حضرت علی اکبر اس طرح خیمۂ عصمت سے برآمد ہوئے کہ

حسامؔ دوش پہ اللہ کے ولی کی طرح
یہیں سے پڑ گیا ابرو میں بل علی کی طرح

حضرت علی اکبر واردِ میدانِ کارزار ہوئے۔ اور تیغِ خوں آشام علم فرمائی۔ تلوار کے پھل کے سلسلۂ تعریف میں مرثیہ نگار نے ایک مصرع خوب کہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"زمیں پہ اختر دنبالہ دار نکلا ہے"

جنگ شروع ہوتی ہے۔ شمشیر حضرت علی اکبرؓ نے دشمنانِ حسینی کا یہ حال بنا دیا تھا۔ کہ

امان و امن کی خاطر ہر اک ترستا تھا
سروں پہ سر تو لہو پر لہو برستا تھا

تلوار کی تعریف

گری وہ تیغ سروں پر تو سر دو نیم ہوئے ۔۔۔ پڑی کمر پہ تو بندِ کمر دو نیم ہوئے
چلی تبر پہ تو دست تبر دو نیم ہوئے ۔۔۔ بڑھی تو ظلم کے اونچے شجر دو نیم ہوئے
اٹھی تو روشنی اک صورت چراغ ہوئی
نہالِ جور جو کاٹے تو باغ باغ ہوئی

؎۱ حسام بمعنی تلوار

گھوڑے کی سبک رفتاری کا یہ عالم ہے۔ کہ ؎

نظر میں پھرتا ہے اور پھر نظر نہیں آتا

نقشۂ ہزیمت

چہار سمت ستمگار بھاگے جاتے تھے علم گرے تھے علم دار بھاگے جاتے تھے

یہ خوفِ جاں تھا کہ رہوار بھاگے جاتے تھے لڑے بھڑے ہوئے اسوار بھاگے جاتے تھے

قدم نہ ٹھہرے حدیں مورچوں کی چھوٹ گئیں

جمی جمائی ہوئی سب قطاریں ٹوٹ گئیں

ایک زبردست پہلوان حضرت علی اکبر سے مقابلہ کرنے کے لئے نکلا۔ اس کے اسلحہ اور ہیئت کے سلسلۂ بیان میں مرثیہ نگار ڈھال کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔ کہ۔ ؎

سپر سیاہ کہ جوں رودِ نیل کا گرداب

الغرض نیزہ بازی شروع ہوتی ہے۔

ملی نظر سے نظر چتونیں بگڑنے لگیں

لڑے یہ کیا کہ سنانیں بھی اُٹھ کے لڑنے لگیں

اور

کبھی اُدھر کبھی اس سمت ہاتھ مڑتے تھے

شرر سنانوں سے لڑ کر ہوا پہ اڑتے تھے

حریف نیزہ بازی سے عاجز آگیا۔ تلوار کی جنگ ملاحظہ ہو۔

معرکہ آرائی

بلند ہاتھ میں تیغوں کے وار چلتے ہیں کنوتیاں فرس تیز دم بدلتے ہیں

گرمی جو دھوپ ہے حلقے زرہ کے جلتے ہیں   وہ جب دبکتا ہے اشرار ہاتھ ملتے ہیں

جری کی ضرب کا لنگر اُٹھا نہیں سکتا

یہ خوف ہے کہ شقی سر اُٹھا نہیں سکتا

حضرت علی اکبر رضؓ نے حریف کو تلوار کے سایہ میں لے لیا۔ اور پھر شمر کو آواز دی۔ دیکھ تیرے پہلوان کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے، اگر ہمت ہو تو اس کی مدد کر۔ اسی سلسلۂ بیان میں آپ فرماتے ہیں

یہ رنگ دیکھکے خود مارے ڈر کے زرد ہے تو

بچا لے اُسکو تو جانیں یہ ہم کہ مرد ہے تو

شمر اپنی فوج کے پہلوان کی مدد کے لئے بڑھنا ہی چاہتا تھا۔ کہ حضرت علی اکبر رضؓ کی تلوار نے حریف کے دو ٹکڑے کر دئے۔ یہ دیکھکر فوج خوف زدہ ہو گئی۔ عمر ابن سعد للکار کر حکم دیتا ہے۔ کہ

ہٹے اُدھر نہ کوئی فوج کے جوانوں میں

اب اس دلیر کو ہاں گھیر لو سنانوں میں

حضرت علی اکبر رضؓ مجروح ہو گئے۔ جسطرف نگاہ اٹھتی ہے۔ دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں۔ مرثیہ نگار اس موقع پر لکھتا ہے:۔ کہ

مرقع نگاری

وہ فوج ظلم کے ریلے وہ اُقْتُلُوا[۱] کی پکار   اُدھر پیادے ہیں گھیرے ہوئے ادھر سوار

تبر بھی پڑتے ہیں چلتے ہیں برچھیوں کی بھی وار   بڑھا ہے ضعف نہیں طاقت وغا زنہار

سلہ[۱] اُقْتُلُوا بمعنی قتل کردو

گھٹا ہے زور جری کو ہے پیاس جینے سے
کھلے ہیں زخم لہو بہ رہا ہے سینے سے

اسی حالت میں

کلام درد زبانِ جناب سے نکلے
قدم جو کانپ رہے تھے رکاب سے نکلے

اور اس کے بعد

فرس سے گرتے ہی ریتی پہ اس طرح تڑپے
زمیں پہ ماہی بے آب جس طرح تڑپے

اسی عالم میں جناب امام حسین علیہ السّلام کو اس طرح پکارتے ہیں:۔

پسر سے آپ کے خالی زمانہ ہوتا ہے
اب آئیے کہ مسافر روانہ ہوتا ہے

جناب امام حضرت علی اکبر کے قریب پہنچے، فرزند کو آلودہ خاک و خون دیکھکر بے اختیار ہو گئے۔ اور

گرے زمیں پہ اور آنکھوں سے اشک ڈھلنے لگے
لہو بھرے ہوئے ماتھے پہ مُنہ کو ملنے لگے

جناب امام مجروح فرزند کو خیمہ عصمت میں لانے کے لئے آغوش میں لیکر اٹھانا چاہتے تھے۔ کہ ناگاہ

نہ تاب درد کی لائے گذر گئے اکبرؓ
پدر کے ہاتھوں پہ سر تھا کہ مر گئے اکبرؓ

مرزا اوج

کرشمہ سازِ فصاحت ہے خوش بیانیِ اوج
سخن طرازِ بلاغت ہے نکتہ دانیِ اوج
فضائے باغِ طلاقت ہے تر زبانیِ اوج
ضیائے طورِ لطافت ہے جانفشانیِ اوج
کلیم کلمۂ طیّب ہے لا کلام دہن
نزولِ جوشِ مضامین کا ہے مقام دہن

ہے عندلیبِ فصیح البیاں زباں میری
نشید بلبلِ دستاں ہے داستاں میری
ہیں آبِ رنگِ چمن خوش بیانیاں میری
ہے نکہتِ گلِ مضموں کہاں کہاں میری
کسے پسند یہ عطریت عمیم نہیں
وہ باغ کونسا ہے جس میں یہ شمیم نہیں

بلند نظم کے میداں میں نشانِ سخن
کہ معرکہ میں ہے آہنگِ امتحانِ سخن
ستارے لفظ ہیں مسطر ہے کہکشانِ سخن
ہے سرزمینِ سخن آج آسمانِ سخن
ورق پہ سرخیِ مضموں سے ہے بہارِ شفق
فلک پہ جیسے دمِ صبح لالہ زارِ شفق

پسند منکرِ ناداں سے ہے خطاب کسے
ہے ردّ و قدح کی یاں عادتِ خراب کسے
سنیں سوالِ جہالت ہے اتنی تاب کسے
دماغِ بحث کسے فرصتِ جواب کسے
یہ گلرخوں کی ہیں زلفیں ہمیشہ الجھینگی
یہ گتھیاں دلِ عاشق کی ہیں نہ سلجھینگی



مرزا اوج لکھنوی

مرثیہ نگار مضامین نعت اس طرح نظم کرتا ہے۔

درود پڑھ کہ ہے پیش نگاہ منزلِ نعت ۔۔۔ ہے بعد منزلِ حمد الہ منزلِ نعت
بلند رتبہ فزوں پایگاہ منزلِ نعت ۔۔۔ کہ منزلت کی ہے خود عزوجاہ منزلِ نعت
یہ وہ جگہ ہے کہ جلتے ہیں پر فرشتوں کے
ادب سے اُٹھ نہیں سکتے ہیں سر فرشتوں کے

زہے پیمبرِ عالی مقام صلّ علے ۔۔۔ زمیں کی زیب فلک احتشام صلّ علے
وہ کون؟ حضرت خیر الانام صلّ علے ۔۔۔ ہے مصطفےٰ لقب احمد ہے نام صلّ علے
ہزارہا شہِ ابرار پر درود و سلام
پھر اُن کی عترتِ اطہار پر درود و سلام

کھلی ہے نقشِ کفِ پا سے راہ چارۂ عرش ۔۔۔ ہے اُن کے پاؤں کی نعلین گوشوارۂ عرش
لباس کہنہ کے پیوند ماہ پارۂ عرش ۔۔۔ ہے اُنکے جلوہ سے چمکا ہوا ستارۂ عرش
ہو کیوں نہ رتبۂ اعلا سے اوج فکر ادنٰے
ہے اُنکے قرب پہ قوسین کا بھی ذکر ادنٰے

جلالِ حق ہیں یہی رحمتِ خدا ہیں یہی ۔۔۔ خطا کو ناز ہے وہ صاحبِ عطا ہیں یہی
جہازِ اُمتِ عاصی کے نا خُدا ہیں یہی ۔۔۔ خدا کی شانِ حدوثِ قدم نما ہیں یہی
یہی ہیں اصل مرادِ خدا مریدِ خدا
یہی ہیں اوّلِ مقصود کا بُریدِ خدا

تمام لطف و کرم حق کے ان پہ عائد ہیں ۔۔۔ ہے شاہد ان کا خدا یہ خدا کے شاہد ہیں
جبینِ سجدہ سے پہلے یہ حق کے ساجد ہیں ۔۔۔ خدائے واحد و یکتا کے فعلِ واحد ہیں

جمال پاک میں ہے قدرتی حشم کا عکس
ہے اس حدوث کے آئینہ میں قدم کا عکس

مرثیہ نگار نعت کے بعد منقبت جناب امیر علیہ السلام کے سلسلہ میں حضرت علی اکبر کی ولادت اور حلیہ کا ذکر کرتا ہے۔ پھر جناب امام حسین علیہ السلام کے صبر و رضا کا بیان کرتے ہوئے حضرت علی اکبر کے واقعہ شہادت کی طرف اس طرح متوجہ ہوتا ہے۔

آخری رخصت

بیان کرتے ہیں یوں راویاں حزن و ملال — یہ اُس دم آلِ نبی کا تھا اضطراب سے حال
کہ ماں کی گودیوں سے گر پڑے صغیر اطفال — ہر ایک گام پہ رکھتا تھا بڑھ کے شاہ کا لال
سماں وداع کا آنکھوں کے نیچے پھرتا تھا
کہ پردہ خیمے کا اٹھتا تھا اور گرتا تھا

الغرض حضرت علی اکبر رخصت ہو کر میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہوئے گھوڑے کے سلسلہ تعریف میں شاعر اس طرح کہتا ہے

گھوڑے کی تعریف

دہانہ چاب کے کف در دہن چلا توسن — سحاب تر کی طرح قطرہ زن چلا توسن
وہ برقِ نعل سے آتش فگن چلا توسن — صفوں کو روندتا جاتا ہے منچلا توسن
بجا سموں کے تلے اہلِ کیں کی قسمت ہے
کہ چرخ میں دُم گاو زمیں کی قسمت ہے

اسی سلسلۂ بیان میں ایک بیت ملاحظہ ہو۔

فرس ہی رشک صبا خارس آبروئے بہار
اڑی ہے نگہت گل لیکے رنگ و بوئے بہار

اس کے بعد شاعر کہتا ہے۔

رُکا طبیعت فارس کی طرح رن میں فرس
اُڑے شرر پہ سبک ہو کے رن میں صورتِ خس
کہا سپاہ سے ضیغم نے تھم کے چند نفس
کہ رزم کا تھا اسی بزدلی پہ دعوٰی بس

جو وا ہوئے لب گویا رجز کے پھول کھلے
سخن کا باغ کھلا یا رجز کے پھول کھلے

شاعر ساقی نامہ شروع کرنے کے بعد سلسلۂ بیان میں ساقی کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

نوردگاہ سے کترا کے تو چلا ہے کدھر
تری ادا پہ لگاتے ہیں قہقہے ساغر
لبِ سبو سے تبسم عیاں ہے سرتاسر
وغا کی قلقلِ مینا سنا رہی ہے خبر

بڑھا ہے تیغ بکف قلعہ گیر[1] کا پوتا
چڑھا ہے رن پہ جنابِ امیر[1] کا پوتا

تلوار کی تعریف

وہ دیکھ میاں سے شمشیرِ برق زا نکلی
کہ چشمِ مست سے کیفیتِ ادا نکلی
ادھر بھی کیا وہی موجِ سرور آ نکلی
کہ جس پہ خود لبِ ساغر سے واہ وا نکلی

سرِ عدو پہ گری یوں وہ شعلہ رو جا کر
کہ جس طرح کوئی سرمست ناز اٹھلا کر

خوشا حسام زہے ثانیِ رسولِ[2] زمن
ہلالِ پنجۂ خورشید میں ہے ضو افگن
خموش ہیں دہن زخم بولتا[3] ہے رن
یلن ہے لبِ شمشیر سے صدائے بزن

---

[1] خطاب ہے حضرت علی کا [2] مراد حضرت علی اکبر سے ہے اسلئے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل مشابہ تھے۔ [3] یعنی ہنگامۂ شور بپا ہے۔

عجب صدا لبِ خونیں نواسے تیغ کی ہے
کہ جان ہونٹوں پہ ہر ایک بیدریغ کی ہے

تلوار کی تعریف

وہ طے جہاں کا نشیب و فراز کرکے چلی سروں پہ چڑھ کے چلی سینوں میں اُتر کے چلی
بھری لہو میں تو کچھ اور بھی نکھر کے چلی تھی دل کی چوٹ کہ ہر وار پر اُبھر کے چلی
نہ سینے سے جو کوئی صورتِ فرح نکلی
تو دل سے غرق بخوں آہ کی طرح نکلی

تلوار کی تعریف میں ایک بیت اور ملاحظہ ہو

اثر تھے رنگ پہ یوں آب کی جھلاجھل کے
کہ جیسے عکسِ شفق موجِ آب میں جھلکے

شاعر پھر کہتا ہے:۔

وہ اس کا یا رطیہ قد اور وہ چھریرا ڈیل وہ آب و تاب کہ قطعی جو ہے برش کی دلیل
نہ زندگی سے ہوں سیراب کیوں سب اسکے قتیل رکھی ہی نابوں نے مقتل میں کشتۂ خونکی سبیل
اُٹھا ہے رن میں شجاعت کے امتحان سے ہاتھ
سب آبِ تیغ پہ دھو بیٹھے اپنی جان سے ہاتھ

پھری ہر اک دہنِ زخم میں زباں کی طرح زبانِ زخم پہ ساکن ہوئی فغاں کی طرح
در آئی سینہ پر کینہ میں سناں کی طرح نکل گئی تنِ اعدا سے کھنچکے جاں کی طرح
جانبِ چشم میں پہنچی نگاہ کی صورت
تو قلبِ فوج میں تھی مدِّ آہ کی صورت

معرکہ آرائی

اگرچہ پیاس سے تھا مضطرب وہ کشتۂ غم مگر دلیری و جرأت کا تھا وہی عالم
دکھا رہی تھی سروہی اسی طرح چم خم کہ خون چاٹ کے بڑھتا تھا اور اس کا دم
رہی لڑائی جو تا دیر بد قرینوں سے
رواں تھے خون کے فوّارے آستینوں سے

عدو تھے چار طرف مثل ابر چھائے ہوئے وفور ضعف سے اکبر تھے سر جھکائے ہوئے
ہزارہا تنِ نازک پہ زخم کھائے ہوئے فرس پہ جھومتے تھے خون میں نہائے ہوئے
نہ چوٹیں سامنے کی وقتِ امتحاں روکیں
کہ مرنے والے نے سینہ پہ برچھیاں روکیں

آخرکار حضرت علی اکبرؓ شدّتِ ضعف و تشنگی کی تاب نہ لا سکے اور گر پڑے اور کسی ظالم و بیدرو نے شہید کر ڈالا۔

حضرت علی اکبر میدانِ جنگ میں پہنچے۔ اور رجز خوانی کے سلسلہ میں فرمایا کیوں ہم کو ٹوکتے نہیں۔ تم کیسے مرد ہو۔

ندرتِ تمثیل

ہیجان ہو گیا رگِ غیرت کو نا گہاں ہر مردہ دل کے قالبِ بیجاں میں آئی جاں
سیدھی چمک چمک کے ہوئیں برق و سناں فوراً اکڑ اکڑ کے ہوئی لیس ہر کماں
نکلی حضور کی بھی سروہی میان سے
چھٹتا ہے جیسے تیر شہاب آسمان سے

حضرت علی اکبرؓ مصروفِ جنگ ہیں۔ تلوار کی تعریف میں شاعر کہتا ہے کہ

تلوار کی تعریف

بند سپر سے خود پہ آئی چلی پھری چار آئینے میں صاف در آئی چلی پھری
اونچو نکے سر چڑھی اُتر آئی چلی پھری بیٹھی کہاں اِدھر اُدھر آئی چلی پھری
تلوار پر عدو کی جو وار اُس کا چل گیا
موئے میانِ تیغ کا کس بل نکل گیا

کتنی ہی بار تیغ دو پیکر اوٹھی گری بجلی کی طرح باندھ کے چکر اوٹھی گری
قلب و جناح میں سر لشکر اوٹھی گری گہنا کی طرح وہ صاحب جوہر اوٹھی گری
سن سن چلی رگوں کا لہو چاٹتی ہوئی
تن سے پھری تو لاشوں سے رن پاٹتی ہوئی

لیلئ تیغ حسن دکھاتی تھی ہر طرف کب ماہ نو نے خواب میں دیکھے تھی یہ شرف
شامی پرے جما کھڑے تھی جو صف بصف جوہر نہ کہئے غصہ سے منہ میں بھرا تھا کف
دشمن کی ڈھال کہتی تھی میں کوہِ قاف ہوں
چلاتی تھی یہ تیغ میں خارا شگاف ہوں

جنگ کرتے ہوئے حضرت علی اکبر بھی سر سے پانوں تک زخموں میں چور ہو جاتے ہیں۔ اور آخر کار فرش خاک پر گر کر جناب امام کو پکارتے ہیں۔ جناب امام فرزند کی آواز سنکر بیتابانہ قریب پہنچتے ہیں۔ حضرت علی اکبر ایک نظر حسرت پدر بزرگوار پر ڈالتے ہیں اور دنیائے ناپائدار سے رخصت ہو جاتے ہیں

جاوید

جوشِ رنگینی

ہاں زباں پھر سے گہر ریزِ دہن ہو میرا
آج پھر طرّۂ دستارِ سخن ہو میرا

بوئے گل ہوں کسی گلشن میں وطن ہو میرا
اُڑ سکے رنگ نہ جس کا وہ چمن ہو میرا

اس سے دوری کی ہوا کو بھی نتاب آئیگی
سانس لینے میں بھی خوشبوئے گلاب آئیگی

نخلِ امید وہی ہیں جو ثمر دیتے ہیں
پھل ریاضت کا مجھے شام و سحر دیتے ہیں

دلِ مجروح کی عالم کو خبر دیتے ہیں
مسکرانے میں لہو زخم جگر دیتے ہیں

آگ بجھتی ہے گریباں کی نہ اب داماں کی
ایک بجلی ہے چمک زخم دلِ سوزاں کی

لایقِ سیر اچھا ہے یہ گلشن میرا
رنگ اُڑانے لگا آخر گل سوسن میرا

گرد ہیں پھول تو ہے بیچ میں مسکن میرا
کھلتی کلیوں سے بسا جاتا ہے دامن میرا

ایسی خوشبو کا جو باطن میں اثر ہو جائے
میرے عارض کا پسینہ گلِ تر ہو جائے

صرف[1] سے بھی تو نہ کم ہوگا خزینہ میرا
چل کے رُکتا نہیں دریا میں سفینہ[2] میرا

ایک معنی کا ذخیرہ ہے کہ سینہ میرا
آگ عالم میں لگاتا ہے پسینہ میرا

مجھسے جو ربط و تعلق ہے وہ رُوحانی ہے
اصل میں آگ ہے اور دیکھنے میں پانی ہے

لہ صرف بمعنی خرچ کرنا۔ ؂ سفینہ بمعنی کشتی۔

شاعر کہتا ہے۔ کہ زمانہ کی شکایت کوئی نئی بات نہیں، جو لوگ فہم سلیم رکھتے ہیں۔ وہ میری اس بات کو تسلیم کرینگے۔ پھر کہتا ہے۔ آجکل یہ عالم ہے۔ کہ بزرگوں کی تعظیم کو بھی چھوٹے اپنے توہین سمجھتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں کچھ بند ملاحظہ ہوں

ناقدری زمانہ

اہل عالم کی طبیعت کا بدلنا ہے محال اصل میں تازگی گل کا سبب کیا ہے اُبال
نقل اور اصل میں جو فرق ہے روشن ہے کمال نخل سے کام نہیں گل کا ہے ہر اک کو خیال
لوگ غیروں کی ریاضت کا ثمر پاتے ہیں
پھول خود گرمی بازار سے مرجھاتے ہیں

نخل سے جو ہیں جدا اُن کو ثمر کیا ہے حصول بعد اک رات کے یکتائی کا دعوا ہی فضول
قصۂ باب خزاں میں نہیں گنجائش طول مطمئن ہے وہ شجر جس کے ہیں ٹوٹے ہوئے پھول
نخل خوش ہے کہ ثمر پھر بھی ہیں ملنے والے
پھول کل آج سے بھی بڑھ کے ہیں کھلنے والے

اس کے بعد شاعر دنیا کی بے ثباتی کے متعلق کچھ عبرت انگیز بند لکھتا ہے۔ پھر واقعات کربلا کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے۔ کہ جناب امام حسین علیہ السلام کے تمام عزیز و رفیق جام شہادت نوش کر چکے اور

جذبۂ ایثار و محبت

اب کوئی پاس نہیں ہے علی اکبر کے سوا دیکھتے ہیں عجب انداز سے روئے آقا[1]

[1] مراد حضرت امام حسین سے ہے۔

نہ تو کچھ عرض کی جرأت نہ تحمل کی ہے جا کبھی یہ سوچ کہ یہ آج کے دن ہو گیا کیا

جب سے آتا ہے لب تک جو نفس آتا ہے
ضبط فریاد سے دم اور گھٹا جاتا ہے

آخر شوق شہادت سے بیقرار ہو کر جناب امام کیخدمت میں حصول اجازت کے لئے عرض پیرا ہوئے۔ جناب امام ارشاد فرماتے ہیں

گھر میں تم صبح سے کے بار گئے تھے دلبر پالنے والوں کی محنت پہ نہ کی تم نے نظر
ایک جانے میں تمہارے کئی جانوں کا ہے ڈر تم سے بڑھ کر ہے مجھے حال کی بانو کے خبر

اس میں کیا شک ہے غم اسکا ہے قلق اسکا ہے
جسنے اٹھارہ برس پالا ہے حق اسکا ہے

حضرت علی اکبرؓ کی نگاہوں کے سامنے شہید عزیزوں کی صورت پھر گئی۔ جذبۂ غیرت وحیا سے متاثر و متالم ہو کر عرض کرتے ہیں۔

ولولہ خاک ہوا جنگ کا وہ دل نہ رہا
گھر میں تنہا بھی تو جانیکے ہیں قابل نہ رہا

اُدھر یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ کہ فضہؑ نے آکر حضرت علی اکبر سے کہا کہ آپ کو آپ کی پھوپھی اور والدہ بلاتی ہیں۔ آپ چلنے کے لئے آمادہ ہوئے لیکن جانے سے قبل

گھر میں جاتے ہوے اس حسن سے رخصت لے لی
شہ کے قدموں پہ گرے گر کے اجازت لے لی

حضرت علی اکبرؓ خیمہ عصمت میں داخل ہوتے ہیں، شاعر نے اس موقع پر

کس قدر پر تاثیر بیت کہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

صفحہ دہر سے یہ شکل بھی مٹ جائے گی
ابھی آپ آئے ہیں کچھ دیر میں لاش آئیگی

حضرت علی اکبر والدۂ محترمہ کیخدمت میں پدر بزرگوار جناب امام حسین علیہ السّلام کی تنہائی و مظلومی کا ذکر کرنے کے بعد عرض کرتے ہیں کہ اب مجھے اجازت دیجئے۔ کہ حضرت پر تصدّق ہو جاؤں۔ پھر اپنے شہید عزیزوں کا خیال آجاتا ہے۔ کس درجہ دردناک الفاظ میں کہتے ہیں

کیا ہوا صبح سے عالم میں بری چلتی ہے
بوئے خون آتی ہے اور دل پہ چھری چلتی ہے

حضرت شہربانو فرزند کو سر بکف دیکھکر مضطرب و بیقرار ہو جاتی ہیں۔ لیکن حضرت علی اکبر کا اصرار بڑھتا جاتا ہے۔ اور

درد انگیز

بین سے بیبیوں کے ہلتی تھی خیمہ کی زمین
اضطراب دل مضطر سے یہ ٹھہرے نہ کہیں
آئے کچھ سوچ کے گہوارۂ اصغر[۲] کے قریں
خشک ہونٹھ اور ہوئے چومی جو بھائی کی جبیں

کہا مضطر ہو بہت اے مرے پیارے سمجھا
صاف ہیں نرگسی آنکھوں کے اشارے سمجھا

پھر اپنی پھوپھی حضرت زینت اور والدہ کو حد سے زیادہ بیقرار دیکھکر

پُر درد بیان

علی اکبر نے کہا صبر کا ہے یہ ہنگام
مجھ کو جانے کی ہی جلدی کہیں ہو جائے نہ شام

۱ حضرت علی اکبر کی طرف اشارہ ہے ۲ حضرت علی اکبر کے شیرخوار بھائی۔

جانتا ہوں کہ اجل آنے سے بن جائینگے کام بھائی عابد ہوں جو ہشیار تو کہیئے گا سلام

ہوش باقی اگر اس رنج و محن میں ہونگے

چومیئے گا او نہیں جو ہاتھ رسن میں ہونگے

الغرض حضرت علی اکبر رضؓ کو اجازت وغا مل گئی۔ آپ خیمہ سے برآمد ہوئے۔ اور جناب امام حسین عؑ سے بھی رخصت ہو کر جنگاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں حضرت عباس رضؓ کے کٹے ہوئے ہاتھ نظر پڑے۔ نگاہوں کے سامنے چچا کی مظلومی و شہادت کا نقشہ پھر گیا۔ گھوڑے سے اُتر پڑے۔ اور

آہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی اک بھر کے چلے

اپنی تلوار کو اُن ہاتھوں سے مس کر کے چلے

حضرت علی اکبر کے جوش غضب کا خیال کر کے شاعر کہتا ہے۔

نعمتِ زیست سے ہر ایک جری ترسے گا

آج تلوار کے پانی سے لہو برسے گا

اسی سلسلہ میں پھر کہتا ہے۔

مناقب حضرت علی اکبر رضؓ

جو لڑیں لاکھ سے تنہا وہ غضنفر ہیں یہی شان کہتی ہے کہ اس عہد کے حیدر ہیں یہی

شیر سے جو نہیں دبتے وہ دلاور ہیں یہی دیکھو چہرے کو تو کہدو کہ پیمبرؐ ہیں یہی

جس سے لشکر کی صفیں موڑ دیں وہ دھاریں ہیں

ان کے ہاتھوں کی لکیریں نہیں تلواریں ہیں

لہ حضرت علی اکبر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ بالکل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ تھے

گھوڑے کی تعریف

باگ لیتے ہی رواں رخش سبک خیز ہوا | رن میں وہ اپنے پسینے سے عرق ریز ہوا
اپنے جامے سے ہی باہر دم مہمیز ہوا | رہ گیا گر کے جو سایہ تو فرس تیز ہوا

اتنی محجوب ہوئی راہ سے بھی پھرنے لگی
رخش کے پاؤں پہ تیورا کے ہوا گرنے لگی

صف رویہ پہ فرس اور بھی کچھ بن کے چلا | مطمئن زیچ میں اک قلعۂ آہن کے چلا
کون ایسا تھا کہ جو پاس سے توسن کے چلا | آگیا تھا جو پسینہ تو ہوا بن کے چلا

قید ہو کر نہ رہا حسرت دارماں کی طرح
آنکھ میں آکے اُڑا خواب پریشاں کی طرح

تلوار کے جوہروں کی تعریف میں ایک بیت نہایت نادر ہے۔

اس کے جوہر ہیں نگاہوں میں کھٹکنے والے
یہ وہ تارے ہیں جو دن کو ہیں چمکنے والے

ایک بیت اور ملاحظہ ہو۔

جوہر اس کے ہیں کہ بکھری ہوئے ہیرے نگیں
کیا تماشا ہے کہ ہے دھوپ کہیں چھاؤں کہیں

شاعر پھر اسی سلسلۂ بیان میں کہتا ہے

کوچۂ زخم کی جانب ہی قدم بڑھتا ہے
جان لیتی ہے تو کچھ اور بھی دم بڑھتا ہے

الغرض حضرت علی اکبر میدانِ کارزار میں پہنچ کر مصروف جنگ ہوئے

تلوار کے جوہر ملاحظہ ہوں۔

تلوار کی صفائی

کبھی کاٹا کوئی پہلو کبھی دل چاک کیا
پھر کے دیکھا نہ اُسے اسنے جسے خاک کیا
تھا جو اک عمر کا قصہ اُسے یوں پاک کیا
قوتِ دستِ جری نے اُسے چالاک کیا
تیغ اُٹھی بھی تو لڑنے کی قسم لے کے اُٹھی
رگِ جاں پر کبھی ٹہری کبھی دم لیکے اُٹھی

ساقی نامہ

ساقیا دیدے شراب آج میری باری ہے
فیض ہر سمت ترا بحر صفت جاری ہے
ہجر میں نشہ کا کیا ذکر غشی طاری ہے
مے ہے شیشے میں کہ دل میں کوئی چنگاری ہے
نہیں آیا کوئی آوارہ وطن یوں لٹ کے
بن گیا داغ کلیجے کا دھواں گھُٹ گھُٹ کے

درد کا اس سے گلہ جس نے کہ آرام دیا
جان سی آگئی اس طرح کا پیغام دیا
آج آغاز ہی میں مژدہ انجام دیا
مسکرا کر میرے ساقی نے مجھے جام دیا
لب تلک آج بہکتی ہوئی فریاد آئی
کس محل پر مجھے زخموں کی ہنسی یاد آئی

ساقیا ہاں کوئی پھر جام سفالی دیدے
دیکھ کر اب میرے چہرے کی بحالی دیدے
آزماتا ہوں تری ہمتِ عالی دیدے
جام لبریز کوئی اور کوئی خالی دیدے
اک طلسم اور دکھا دوں اسی میخانے میں
قوتِ جذب سے کھنچ آئیگی میخانے میں

شاعر کیف مستی میں سرشار ہو کر پھر حضرت علی اکبر کی معرکہ آرائی کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے کہ حضرت علی اکبر رض لڑتے ہوئے دریا کے قریب پہنچ گئے۔ دریا کی روانی دیکھ کر قدرتاً تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور عزیزوں کی پیاس یاد آجاتی ہے اس وقت حضرت علی اکبر رض اپنے دل سے فرماتے ہیں:-

خاک دریا یہ ہے گر پیاس میں ہمت ہاریں
اس کی موجیں ہیں مرے دل کیلئے تلواریں

پھر ایک عالمِ جوش میں ارشاد فرماتے ہیں۔

موجزن آج ہو پھر خونِ عدو کا دریا
ایسے دریا سے ملادوں میں لہو کا دریا

حضرت علی اکبر رض کی تلوار نے چاروں طرف ستھراؤ کر دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ دشمن خوف سے چھپتے پھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ بیان میں ایک بیت ملاحظہ ہو۔

لب تلک آتے ہیں تو رگ کے نفس آتے ہیں
زخم بھی خون کی چادر میں چھپے جاتے ہیں

شاعر حضرت علی اکبر کی تلوار کی تعریف اس طرح کرتا ہے

آئینہ بھی ہے وہ تلوار جو دی سرورؑ نے
اس میں منہ دیکھا ہے اٹھارہ برس اکبر نے

حضرت علی اکبر جنگ کرتے کرتے خود بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ ہر چہار طرف سے وار پہ وار ہو رہا ہے۔ آخر آپ گر پڑتے ہیں۔ جناب امام فرزند کے قریب پہنچتے ہیں، یکایک حضرت علی اکبر کو ہچکی آتی ہے۔ اور روحِ انور پرواز کر جاتی



حضرت رشید لکھنوی

ہے۔ اس موقع پر شاعر کہتا ہے۔

حسرت قلب بن سعد جفا جو نکلی
رُوح تن سے کہ گل تازہ سے خوشبو نکلی

رشید

حضرت علی اکبرؓ کی صغیر سنی اور حسن و جمال کے سلسلۂ بیان میں شاعر کہتا ہے۔

جمالِ پاک پہ ہر اک درود پڑھنے لگا
خوشی سے باپؑ کا دل قد کے ساتھ بڑھنے لگا

شاعر پھر کہتا ہے۔ کہ

امنگ دل کی جوانی کے ساتھ بڑھنے لگی
کمان کھنچنے لگی آستین چڑھنے لگی

جب آکے بیٹھتے تھے مسند حسینؑ کے پاس تو دیکھ دیکھ کے ہنستے تھے شاہ نیک اساس
وہی رسول کی صورت اسی طرح کا لباس خیال رہتا تھا انصار کو یہ ہوں نہ اداس

مزا محبتِ دیرینہ کا نکلتا تھا
جب آپؑ کرتے تھے باتیں تو جی بہلتا تھا

اب شاعر واقعاتِ کربلا کی طرف متوجہ ہو کر کہتا ہے۔ کہ جناب امام کے

لہ یعنی جناب امام حسین علیہ السلام ۲ھ یعنی حضرت علی اکبرؓ

تمام عزیز و رفیق شہید ہو چکے، اب حضرت علی اکبرؑ اذنِ وغا طلب کرتے ہیں۔ اور اسی سلسلہ بیان میں

کہا انہوں نے کہ ہیں آپ صاحبِ ہمّت
میں چاہتا ہوں کہ اب مجھکو دیجئے رخصت
تڑپ رہا ہوں پئے سیرِ گلشنِ جنّت
رہی نہ تاب جو دل کو تو بول اٹھے حضرتؑ[1]

خیال مرگ تو اے مرے لال ہے تم کو
پدر ضعیف ہے یہ بھی خیال ہے تم کو

فرزند کی باتیں سُنکر جناب امام کی حالت جو کچھ ہوئی۔ شاعر اس کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچتا ہے۔

یہ سُنکے طاقت صبر و شکیب گھٹنے لگی
دل ملول یہ تڑپا کہ سانس الٹنے لگی

جناب امام حضرت علی اکبر سے ارشاد فرماتے ہیں

ہمارا حق بطرف اب ہے یا نہیں ای لال
تمام لختِ جگر رن میں ہو گئے پامال
نہیں بیان کے قابل جو کچھ ہے دل کا حال
تم ایسے وقت میں رخصت کا کر رہے ہو سوال

مقام غور ہے انصاف سے گذرتے ہو
ذرا سمجھ کے کہو کیسی باتیں کرتے ہو

آخر حضرت علی اکبر کے اصرار پیہم سے مجبور ہو کر ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ تمہارے بعد تمہاری ماں اور تمہاری پھوپھی زینب کا کیا حال ہوگا۔ ذرا یہ بھی تو غور کرو۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] یعنی جناب امام حسین علیہ السلام

نہ میں کہونگا سوئے فوجِ اہلِ کیں جاؤ
جو وہ کہیں تو مجھے عذر کچھ نہیں جاؤ

حضرت علی اکبر پھوپھی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، حضرت زینب رضؑ فرزند کا ارادہ سمجھ گئیں۔ کس درجہ درد انگیز انداز میں ارشاد فرماتی ہیں۔

بدن سے رُخصتِ جاں کا پیام لائے ہو
پھوپھی کے دل کی تڑپ دیکھنے کو آئے ہو

پھر ارشاد فرماتی ہیں۔ کہ

ہوئی ہے پار جوانی جو مرنے جاتے ہو
ریاضتیں میری کیوں خاک میں ملاتے ہو

اسی سلسلہ بیان میں یہ بیت ملاحظہ ہو۔

یقیں ہوا کہ محبّت کا تم کو جوش نہیں
بُرا نہ مانو واری کہ مجھ کو ہوش نہیں

حضرت علی اکبر پاسِ ادب سے کچھ جواب نہ دے سکے۔ لیکن چہرے پر آثار تنغص نمایاں ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت زینب ارشاد فرماتی ہیں

شکن جبیں پہ ہے کیوں مرنے کی رضا کیلئے
خفا ہو مجھ سے کہ ماں سے کہو خدا کیلئے

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

مزاج میں ابھی بچپن ہے اے شبیہ رسول　　یہ ضد نئی ہے کہ مرنے کیواسطے ہو ملول

لہ یعنی حضرت زینب اور حضرت شہربانو والدہ حضرت علی اکبر رضؑ

ستائے دیتے ہو کیوں رونق ریاض بتول بھلا بسی ہوئی بستی اجاڑنے سے حصول

پھوپھی کا نام ہے میرا نہ غم سوا ہوگا

بتاؤ ماں ابھی سن پائے گی تو کیا ہوگا

یکایک حضرت زینب کا دل بھر آیا۔ اسی حالت میں ارشاد ہوا۔ کہ

ستم زدوں کو نہ تدبیر ہے نہ چارا ہے

بس اب خدا کا سہارا ہے یا تمہارا ہے

حضرت زینب اپنی بھاوج حضرت شہربانو کو پکارتی ہیں

اس کے بعد شاعر کہتا ہے۔ کہ

یہ سنکے بانوے ناشاد بیقرار آئی ہوا یہ صدمہ کہ ہونٹوں پہ جان زار آئی

بحال زار و پریشاں وہ سوگوار آئی قریب زینب ناشاد و دل فگار آئی

پسر کو دیکھ کے خاموش بھی رہا نہ گیا

بس ایک آہ تو کی اور کچھ کہا نہ گیا

اُدھر سلام کو یہ گر پڑی وہ تھرا کر اُٹھیں سنبھل کے تو چلائیں ای علی اکبر

کہاں کا قصد ہے قربان ہو گئی مادر جگر پہ نیزہ لگا دل پہ چل گیا خنجر

مرے دُکھے ہوئے دلکو عبث دکھاتے ہو

مجھے بھی لیتے چلو گر جہاں سے جاتے ہو

اسی سلسلہ بیان میں ایک بیت نہایت پُر تاثیر ہے ملاحظہ ہو۔ حضرت شہربانو فرماتی ہیں

گناہ ہے جو کوئی خود سوئے اجل جائے

دعا یہ کر نہیں سکتی کہ دم نکل جائے

اتنے میں جناب امام داخل عصمت سرا ہوتے ہیں اور حضرت علی اکبر کو بمشکل اجازت مل جاتی ہے۔ جناب امام فرزند کو خود اپنے ہاتھوں سے لباس پہناتے ہیں۔ اس موقع پر شاعر کہتا ہے۔ کہ

لباس جب شہ کون و مکاں پہنانے لگے
تو یہ کے ریش مبارک تک اشک آنے لگے

اور یہ عالم تھا۔

کلام شکر کے تھے منہ پسر کا تکتے تھے
یہ ہاتھ کانپتے تھے بند بندہ نہ سکتے تھے

حضرت علی اکبرؓ شوق شہادت میں بیتاب ہو کر میدانِ جنگ کی طرف جانے میں جلدی کر رہے ہیں۔ اس وقت جناب امام فرزند سے ارشاد فرماتے ہیں

اب ایک آن میں ہونا ہے غرق خوں تم کو
ذرا کھڑے رہو جی بھر کے دیکھ لوں تم کو

حضرت علی اکبر خیمہ سے برآمد ہوے۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر عازم میدانِ کارزار ہیں، شاعر اس موقعہ پر کہتا ہے

کبھی ادھر کبھی اس سمت باگ مڑنے لگی
جہاں پناہ کی ڈیوڑھی پہ خاک اڑنے لگی

حضرت علی اکبرؓ میدان کارزار میں پہنچکر مصروفِ جنگ ہوتے ہیں، معرکہ آرائی ملاحظہ ہو

جو اس کو دو کیا یکبارگی تا کمر سر سے ملایا خاک میں اس کو قدم کی ٹھوکر سے
گرا دیا کبھی اسوار کو فرس پر سے اکیلے آپ لڑائی تمام لشکر سے

جنہیں تھا زور شجاعت وہی جواں مارے
تمام فوج کے چُن چُن کے پہلواں مارے

شاعر حضرت علی اکبرؓ کے دست زبردست اور شمشیر بےنظیر کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔ کہ

یہ دست و تیغ سب اوصاف میں برابر ہیں
کہ جتنے اس میں ہنر اُتنے اس میں جوہر ہیں

شاعر تلوار کی تعریف میں کہتا ہے۔ کہ

نہ ڈر سے اُٹھتی تھی ہر ایک بے ادب کی آنکھ
لہو سے دیدۂ جوہر بنے غضب کی آنکھ

پھر کہتا ہے۔

نہ کیوں ہوں صاف صفیں ہونگہ جدھر اُس کی
کہ نام جس کا قضا ہے وہ ہے نظر اُس کی

ایک پہلوان حضرت علی اکبر سے مقابلہ کرنے کے لئے فوج شام سے نکلا، شاعر اس موقع پر ساقی نامہ شروع کر دیتا ہے۔

کدھر ہے اے مرے ساقی شراب کوثر دے — رُکے نہ ہاتھ پیاپے پلا برابر دے
نہ جس کا نشہ گھٹے حشر تک وہ ساغر دے — نہ دے سبو و خم و جام دل مرا بھر دے

ترنگ نشہ کی ہے رنگ اب بگڑتا ہے
کہ دینؑ پناہ سے اک دینؑ فروش لڑتا ہے

لہ مراد حضرت علی اکبر سے ہے۔ ٢ہ مراد دشمن سے ہے

حریف آپ کا نام و نسب دریافت کرتا ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں۔

چراغ خانۂ ابنِ بتول کہتے ہیں
مجھی کو لوگ شبیہ رسول کہتے ہیں

آخر جنگ شروع ہوئی دیر تک معرکہ آرائی رہی۔ اور حریف ایک آخری حملہ کرتا ہے۔

معرکہ آرائی

دیا کے گھوڑے کو لے آیا زد پہ ظلم شعار ۔۔۔ نہ پھر سکا جو کسی سمت الف ہوا رہوار
لگائی تنگ پہ خم ہو کے آپ نے تلوار ۔۔۔ بس اک اشارے میں دو ہو گیا معہ رہوار

نئی یہ تیغ زنی ہے ہر اک پکار اُٹھا
گرے جو دو تو زمیں ہل گئی غبار اُٹھا

حریف کو قتل کر کے حضرت پھر مصروف جنگ ہوتے ہیں۔ فوجِ شام کا یہ حال ہے۔ کہ

نہ بھاگا جاتا تھا سر کٹ کے آگے گرتے تھے
یہ ڈر تھا موت کے دامن میں چھپتے پھرتے تھے

آخر کار خود بھی سرتاپا مجروح ہوئے، اور دشمن کے کسی سپاہی نے نیزے کا ایک ایسا وار کیا کہ آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور فرش خاک پر گر پڑے۔ اسی حالت میں شہید ہو گئے۔

امین

شاعر حضرتِ علی اکبر رضؔ کے حسن و جمال کے سلسلۂ بیان میں دانتوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

مخزنِ عدن کا دُرج دہاں ہے لئے ہوئے
سُمرن یہ موتیوں کی زباں ہے لئے ہوئے

حضرت علی اکبر باصرار اجازت طلب ہوتے ہیں، جناب امام مجبور ہو کر ارشاد کرتے ہیں کہ اپنی ماں اور پھوپھی سے اذنِ وغا طلب کرو، وہ اگر اجازت دیدیں تو میری طرف سے بھی اجازت سمجھیں حضرت علی اکبر خیمہ عصمت میں پہنچکر اپنی پھوپھی حضرت زینب اور والدہ حضرت شہربانو کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں۔ کہ اب جناب امام تن تنہا ہیں۔ تمام عزیز و رفیق شہید ہو چکے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ کہ دادِ سرفروشی دوں۔ یہ سُنکر مخدّرات کی جو کچھ حالت ہوئی شاعر اس کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

تھرّایا قلب اور جگر و دل اُچھل پڑے
تڑپا کلیجہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

لیکن جناب امام کی بیکسی و تنہائی، مظلومی و شہادت کا خیال کر کے جناب زینب اور حضرت شہربانو نے دل کڑا کیا

واری حصولِ اجرِ شہادت میں کد کرو
جاؤ پدر کی وقتِ مصیبت مدد کرو

مژدہ اجازت سُنکر حضرت علی اکبر رض کا تمام حزن و ملال شادمانی و مسرّت سے تبدیل ہوگیا۔ آپ رخصت ہوکر باہر تشریف لیجا رہے ہیں۔ مرثیہ نگار اس موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے

مرقع نگاری

تھا آگے آگے لختِ دلِ شاہِ بحر و بر　　پیچھے حرم کا قافلہ تھا سب برہنہ سر
دامن کو تھامے روتی تھیں بہنیں اِدھر اُدھر　　بانو تھی بیقرار سنبھالے ہوئے جگر
گذرا عجیب صدمۂ غم قلبِ پاک پر
غش آیا بنتِ فاطمہ کو گر کے خاک پر

در کے قریب روتی رہیں بیبیاں تمام　　پردہ اُٹھا کے نکلا وہ صفدر با احتشام
بیٹھے تھے فرشِ خاک پہ غمگیں یہاں امام　　ناگہ پسر نے بڑھ کے کیا آخری سلام
کی عرض شوقِ جنگ میں اب بیقرار ہوں
ارشاد کیجئے تو فرس پر سوار ہوں

الغرض جناب امام سے بھی رخصت ہوکر میدان کارزار میں جلوہ فرما ہوئے۔ جنگ شروع ہوئی۔ اور حضرت علی اکبر نبرد آزما ہوتے ہیں۔ تلوار کی تعریف میں شاعر کہتا ہے

معرکہ آرائی

اللہ ری تیزی دمِ شمشیرِ آبدار　　دو دو ہر ایک ضرب میں ہوتے تھے چار چار
اُٹھ اُٹھ کے گر رہی تھی جو شمشیر بار بار　　مجروح تھے پیادے ادھر اسطرف سوار
سر پھر رہے تھے لوٹتے اکثر زمین پر
پیکر تڑپ رہے تھے سراسر زمین پر

ایک زبردست پہلوان فوجِ شام سے نکلکر عمر ابن سعد کے پاس آیا۔ اور حضرت علی اکبرؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ " اس کو پیامِ مرگ مرا ایک وار ہے "۔

یہ کہہ کے باگ لی فرس تند خو بڑھا خورشید رُو جدھر تھا اُدھر تیرہ رُو بڑھا

دریائے قہرِ حق کی طرف کینہ جو بڑھا دُرِّ نجف سے لڑنے کو ابرِ دو بڑھا

آمد تھی اُس کی یا کہ جھپٹ مست فیل کی

تھا شور موج آتی ہے دریائے نیل کی

پہلوان حضرت علی اکبر کے مقابل ہوا۔ اور لاف زنی کے بعد حملہ آور ہوا، لیکن

معرکہ آرائی

کرنے ابھی نہ پایا تھا ظالم[۱] سناں کا وار ماری جری[۲] نے ڈانڈ کلائی پہ ایک بار

اللہ ری ضرب کانپ گیا دستِ نابکار چہرے سے آشکار ہوا رنگِ انتشار

غم کی سنان لگی جگرِ دردناک پر

ساعد کو صدمہ پہنچا گرا نیزہ خاک پر

اب تلوار کی جنگ شروع ہوتی ہے

معرکہ آرائی

چلتے ہیں جانبین سے قہر و غضب کے وار گھوڑوں کی دوڑ دھوپ سے میدان ہے پُر غبار

جب دونوں تیغیں ملتی ہیں ہوتا ہے آشکار دو بجلیاں لپک کے لپٹتی ہیں بار بار

افسر تمام دیکھ رہے ہیں ڈٹے ہوئے

حربے شقی کے گرد پڑے ہیں کٹے ہوئے

---

۱ یعنی حریف۔ ۲ یعنی حضرت علی اکبرؓ

حضرت علی اکبرؓ ایک ایسا ہاتھ مارتے ہیں۔ کہ حریف دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اپنے پہلوان کو آلودۂ خاک و خون دیکھکر فوجِ شام چاروں طرف سے نرغہ کر کے گھیر لیتی ہے۔ حضرت علی اکبرؓ از سرتا پا مجروح ہو چکے ہیں شاعر اس موقع پر کہتا ہے کہ

غش آرہا ہے آنکھوں کے آگے اندھیرا ہے
اک پھول کو ہزاروں ہی خاروں نے گھیرا ہے

اس طرف تو حضرت علی اکبر کا یہ عالم ہے اُدھر خیمہ عصمت میں حضرت زینب بارگاہ احدیت میں اپنے بھتیجے کے لئے اس طرح دعا کرتی ہیں۔

یارب پسر کے غم میں نہ ماں کو رولائیو — نیزے کے پھل سے لختِ جگر کو بچائیو
تو پہلے مجھ کو دارِ فنا سے اٹھائیو — لاشہ نہ مجھ کو ایسے جواں کا دکھائیو
کوئی جیے گا چھُٹ کے نہ اس خوش صفات سے
وابستہ سب کے دم ہیں اسی کی حیات سے

لیکن اتنی دیر میں حضرت علی اکبر پر بیشمار وار چل گئے۔ یہ عالم تھا کہ ناگاہ

سر پر پڑی جو تیغ جبیں تک اُتر گئی — تصویر ہائے خون میں محمدؐ کی بھر گئی
پہلو فگار کوئی سناں آکے کر گئی — دل پر جری کے قہر کی ایذا گذر گئی
نازک بدن میں گل سی جو پوشاک پاک ہے
تیغوں سے وہ بھی مثل جسد چاک چاک ہے

اور

حربے بدن پہ سینکڑوں دشمن لگاتے ہیں
جھک کر کبھی سنبھلتے ہیں گہ ڈگمگاتے ہیں

آخر حضرت علی اکبر فرشِ خاک پر گر پڑتے ہیں۔ جناب امام کو آواز دیتے ہیں۔ آپ فرزند کے قریب تشریف لیجاتے ہیں۔ لیکن حضرت علی اکبر کچھ کہنے ہی نہ پائے تھے۔ کہ

ہچکی جو آئی موت کی اکبر رض گذر گئے
پورے جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ مر گئے

جناب امام کے تمام رفیق و عزیز داد شجاعت دیدیکر واصل بحق ہوئے، حضرت علی اکبر کے اذن وغا طلب کرنے میں آخر کار جناب امام مجبور ہو کر اجازت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مادر کی زیست باپ کا نام و نشاں تھے تم
غم اس کا ہے بڑا کہ ابھی نوجوان تھے تم

پھر ارشاد ہوتا ہے

پھپھیوں کے تن کی روح ہو بہنوں کی جاں ہو تم　　آلِ نبی کا چین ہو راحت رساں ہو تم
ہم صورت جناب رسولِ زماں ہو تم　　گھر میں حسین کے تو فقط اب جواں ہو تم
کیا حال دل ہو دیکھئے مشکل یہ داغ ہے
جب تم نہیں حسین کا گھر بے چراغ ہے
عباس مر کے توڑ گئے ہیں مری کمر　　قاسم کے بھی فراق سے خون ہر دل و جگر
رن[۱] میں تڑپ کے مر گئے خواہر کے دو پسر　　باقی تھے ایک تم سو تمہارا بھی ہے سفر

۱ـ رن بمعنی میدانِ جنگ

بیکس ہوں کوئی دوست نہیں آشنا نہیں
اچھا سدھار و ہم کو کسی سے گلا نہیں

حضرت علی اکبر جناب امام سے رخصت ہو کر میدانِ کارزار کی طرف روانہ ہوئے، شاعر ان کے حلیہ کے سلسلہ بیان اس طرح رقم طراز ہوتا ہے

حضرت علی اکبر کا حلیہ

زلفیں دراز ہمسر گیسوئے مصطفےٰ　　خم ابروؤں میں صورت ابروئے مصطفےٰ
آنکھیں بھی مثل نرگسِ آہوئے مصطفےٰ　　خُلق حسنؑ جلالِ علی خوئے مصطفےٰ

چہرے کی ضو سے ماند ہے نور آفتاب کا
سب حُسن ہے رسُول خدا کے شباب کا

حضرت علی اکبر میدانِ کارزار میں پہنچکر معرکہ آرا ہوتے ہیں۔

نقشہ جنگ

تنہا ادھر حضور اُدھر مجمع کثیر　　ڈھالوں کی وہ سیاہ گھٹائیں برنگِ قیر
آتش فشاں ہوئی جو وہ شمشیر بے نظیر　　بھڑکی یہ آگ رن میں کہ جلنے لگے شریر

جب گر کے برق تیغ دودم تن کے اُٹھتی تھی
رن کی زمین کی گرد دُھواں بنکے اُٹھتی تھی

بازار جنگ گرم تھا اور دھوپ بھی کڑی　　جانیں خریدوں موت کو کوشش یہ تھی بڑی
باندھی تھی ابر تیغِ دودم نے عجب جھڑی　　بارش سروں کی تھی تو تنوں کی دھڑا دھڑی[۱]

---

۱ یعنی جسم کٹ کٹ کر برابر گر رہے تھے۔

ہاتھ اپنے کینہ جویوں نے دھوئے حیات سے
دریائے خوں کا پاٹ بڑھا تھا فرات سے

تلوار کی تعریف میں شاعر کہتا ہے۔ کہ

تلوار کی تعریف

جس صف پہ جس پرے پہ گری خوں میں بھر گئی — کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
بولا کوئی ابھی تو یہاں تھی کدھر گئی — اس نے کہا ادھر وہ پکارا اُدھر گئی
یوں چل رہی ہے جیسے بروئے زمیں نہیں
ہر جا یہ مثل برق ہے اور پھر کہیں نہیں

حیراں تھے اس کی چال سے لشکر کے سب دنی — ڈر سے ستمگروں کے تنوں میں تھی سنسنی
ہرگز نہ خم تھا ہو کے جو سیدھی کبھی تنی — موذی کے کاٹ کھانے کو ناگن کبھی بنی
دم میں اجاڑتی ہے یہی گھر بسا ہُوا
پانی بھی مانگتا نہیں اس کا ڈسا ہُوا

تلوار کو آفتاب سے تشبیہ دیکر شاعر نے ایک بیت خوب کہی ہے

پیدا تھے طرفہ ڈھنگ طلوع وغروب کے
مغرب سے وہ نکلتی تھی مشرق میں ڈوب کے

وہ جنگ اور دشت کا تپنا دم زوال — وُہ دھوپ تھی کہ سنگ بھی تپ کر ہوئے تھے لال
وہ بھوک تین روز کی اور وہ عطش کا حال — مرجھا گیا تھا پھول سا رُخ پیاس تھی کمال
کانٹے زبانِ خشک میں گو پڑتے جاتے تھے
دریا سے منہ پھرائے مگر لڑتے جاتے تھے

نقشہ ہزیمت

جنگل میں بندھ گئی تھی ہوا تیغ تیز کی لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
اٹھ سکتی تھی نہ ضرب جو اس حشر خیز کی چاروں طرف صدا تھی گریز و گریز کی
اوکھڑے قدم جو لشکر خانہ خراب کے
سرپٹ اڑا یا رخش کو رانوں میں داب کے

جس غول میں اڑا کے دھنسے آپ خوشخرام کھایا کبھی تیر تو کبھی پڑ گئی حسام
تیروں سے وار کرتے تھے سب نیزہ دار شام چھپ کر کمیں سے آگیا بس ایک تیرہ فام
برچھی کا وار سینۂ اکبر پہ کر گیا
بیٹا علی کے لال کا سب خون میں بھر گیا

بمشکل آپ نے سینۂ بے کینہ سے برچھی کی انی نکالی۔ لیکن
طاقت گھٹی بدن کی تو کچھ بڑھ کے رک گئے
تیورا گئے تو مہرنے پہ سر رکھ کے جھک گئے

شدت ضعف و تشنگی کے سبب غش کھا کر آپ گر پڑتے ہیں، فوج شام میں نعرۂ شادمانی بلند ہوتا ہے۔ جناب امام بیقرار ہو کر فرزند کے قریب پہنچتے ہیں۔ آخر کار[۵۱] بمشکل آپ اپنے فرزند دلبند حضرت علی اکبر کو حرم میں لاتے ہیں۔ حضرت زینب[۵۲] اور حضرت شہربانو پر ایک عجیب عالم سراسیمگی و بیخودی چھایا ہوا ہے۔ حضرت علی اکبر اپنی والدۂ محترمہ حضرت شہربانو اور اپنی پھوپھی جناب زینب کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور کس قدر پرُ تاثیر انداز بیان میں کہتے ہیں۔

سلہ۵ یعنی حضرت علی اکبر رضہ نے تعاقب کیا

کی عرض دل پہ موت کی شمشیر چلتی ہے
ہٹ جائیے کہ روح بدن سے نکلتی ہے
یہ کہہ کے بس تڑپنے لگا وہ نکو سیر کھنچنے لگی جو رُوح بدن کانپا سر بسر
مادر پہ بھی پھوپھی پہ بھی کی آخری نظر بس مسکرا کے باغ جہاں سے کیا سفر
پتھرائی چشم پھول سا رُخ زرد ہو گیا
ہچکی جو آئی موت کی تن سرد ہو گیا

حضرت علی اصغر کی شہادت

حضرت علی اصغر حضرت امام حسینؑ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ حضرت علی اکبر کی شہادت کے بعد حضرت امام اس شیر خوار بچے کو گود میں لئے ہوئے لشکر غنیم میں تشریف لیجاتے ہیں۔ اور فوج اشقیا سے کہتے ہیں کہ یہ ننھی سی جان بھی ہمارے ساتھ کئی روز سے بے آب ہے مانا کہ ہم مجرم ہیں اور اس لئے لایق تعذیر بھی۔ خدارا بتاؤ کہ اس معصوم کا کیا قصور ہے۔ اگر تم صاحب اولاد ہو۔ تو اس بےزبان کی پیاس پر رحم کرو۔ شقی القلب غنیم پر اس تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اتنے میں ابن سعد کے حکم پر حرملہ نامی ایک شخص اپنی کمان اٹھاتا ہے۔ اور ایک تیر سے حضرت علی اصغرؑ کے حلق اور حضرت امام کے دست مبارک کو مجروح کردیتا ہے۔ حضرت امام تیر تو حضرت علی اصغر کے حلق سے نکال لیتے ہیں۔ مگر حضرت علی اصغر اس زخم سے جانبر نہیں ہوتے اور آپ اس معصوم کے لاشے کو لیکر خیمہ اہلبیت میں واپس تشریف لیجاتے ہیں:

مرثیہ نگاروں نے مندرجہ ذیل اُمور کو نہایت زور و خوبی سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) حضرت امام۔ کا حضرت علی اصغر کو شدّت تشنگی سے مدہوش پاکر آپ کو گود میں لئے ہوئے فوج اشقیا کیطرف تشریف لیجانا۔

(۲) لشکر غنیم کو مخاطب کرکے حضرت امام کی پردرد تقریر

(۳) حرملہ کی شقاوت و بیرحمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہادت حضرت علی اصغرؓ

فصیح

نکلے خیمہ سے جو لیکر علی اصغر کو حسین
دونوں ہاتھوں پہ دھرے تھے تن لاغر کو حسین
اُسپہ ڈالی ہوئی اک اجلی سی چادر کو حسین
دھوپ میں سایہ کئے لاتے تھے دلبر کو حسین
اشک آنکھوں سے نہ تھمتے تھے بہے جاتے تھے
سر جھکائے ہوئے خاموش چلے جاتے تھے

دل میں کہتے تھے کہ ای خالق ذو المجد و جلال
میں نے کچھ چیز نہیں مانگی کسی سے تا حال
آج حیران ہوں آتا ہے یہ ہر بار خیال
ان لعینوں سی کروں آب کا کیونکر میں سوال
آج کا روز قیامت سے نہیں کم مجھ کو
علی اصغر کا ہے واللہ بڑا غم مجھ کو

اس طرف تھے شہ بیکس کے یہ پر درد سخن
اس طرف دور سے یہ دیکھ کے بولے دشمن
گیا ہے شبیر کے یہ ہاتھ پہ مانندِ کفن
اک لگا کہنے کہ ہوتا ہے یہ مجھ پر روشن
تشنگی سے کسی معصوم کا دم نکلا ہے
دفن کرنے اسے یہ کشتۂ غم نکلا ہے

ناگہاں تاک کے بیرحم نے مارا اک تیر حلق اصغر کا چھدا دستِ جناب شبیرؑ
تیر جسوقت لگا چونک پڑا غش سے صغیر اس کا پیکان سے گلا بند ہوا وقتِ اخیر
چاہتا تھا کہ کرے گریہ نہ رو سکتا تھا
حلق میں تیر تھا اور باپ کا منہ تکتا تھا

اس وقت حضرت امام حسین نے لشکر اشقیا سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

سخت بیرحم ہو تم کو نہیں کچھ خوفِ خدا خیر پروا نہیں دنیا کا ہے عرصہ تھوڑا
آخر اے اہلِ ستم روز جزا بھی ہوگا اُس دن آؤنگا میں اصغر کو لئے خون بھرا
جو ستم آج کروگے متحمل ہے حسین
ناقصو سمجھے ہو کیا صبر میں کامل ہے حسین

کہہ کے یہ شاہ نے اصغر کو اڑھائی چادر سمتِ خیمہ کے چلے رن سے لئے لاش پسر
پہنچے جس وقت شہ تشنہ لباں ڈیوڑھی پر شرم سے بانو کے جاتے تھے نہ گھر کے اندر
در تلک آکے نہ داخل یہ حرم ہوتے تھے
لاش گودی میں لئے در پہ کھڑے روتے تھے

لاش اصغر رن سے لاتے ہیں حسینؑ زخم بازو کا چھپاتے ہیں حسینؑ
پاؤں آہستہ اُٹھاتے ہیں حسین دل سے اپنے کہتے جاتے ہیں حسینؑ
لاشِ اصغرؑ خیمہ میں جب جائیگی
شہر[1] بانو دیکھ کر مر جائیگی

---

[1] حضرت علی اصغر کی والدہ ماجدہ

دو قدم چلتے ہیں اور تھمتے ہیں شاہ
راس و چپ مڑ کے کرتے ہیں نگاہ
کہتے ہیں نزدیک ہے اب خیمہ گاہ
منتظر ہووے گی بانو در پہ آہ
تیر حلق نازنیں کے پار ہے
خیمہ تک جانا بہت دشوار ہے

میر ضمیر

نیزہ جو کھا کے سینے میں اکبرؑ ہوا تمام
یعنی شبیہ خاص پیمبرؐ ہوا تمام
شہ نے کہا کہ اب مرا لشکر ہوا تمام
اکبرؑ نہیں تمام ہوا گھر ہوا تمام
دل آرزوئے مرگ میں جینے سے سیر ہے
اب ہم کو سر کٹانے میں یاں کتنی دیر ہے

پھر سوئے فلک دیکھ کر فرماتے ہیں۔

عباسؑ کی جدائی سے گو ہی کمر میں خم
پشت و پناہ ہے مری خاطر ترا کرم
اکبرؑ کے قتل سے ہوئے بیکس اگرچہ ہم
تیری مدد کی ہے مجھے امید دمبدم
کیونکر رضا رضا کے سوا لب ہلاؤں میں
اکبرؑ تو جا چکے علی اصغر کو لاؤں میں

مقتل سے تھوڑی دور بڑھے جب بچشم تر
اکبر کی لاش دور سے آئی نہ پھر نظر
سوئے فرات کہنے لگے منہ کو پھیر کر
عباسؑ آج سوتے ہو کیا فرش خاک پر

اصغر کو لینے جاتا ہوں میں خیمہ گاہ میں
رکھیو ضرور لاشۂ اکبر نگاہ میں

امام خیمے میں پہنچکر حضرت علی اصغر کو ہاتھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ حضرت شہر بانو روکتی ہیں۔ کہ علی اصغر کو فوج قاہرہ میں لیجانا مناسب نہیں۔ شائد کوئی شقی القلب انسان اسے بھی ہلاک کر دے۔ امام جواب میں فرماتے ہیں

تاثیرِ بیان

آویگا اس پہ تیر تو ہوجاؤں گا سپر تلوار گر چلیگی تو روکوں گا جسم پر
معصوم کو بچاؤں گا نیزہ چلا اگر اور موت ہی لکھی ہے تو مجبور ہے پدر
تو جانیو کہ راہِ خدا میں فدا کیا
اکبرؑ جوان مر گیا تو ہم نے کیا کیا

خلیل

یاں دور تھا دریا سے بپا خیمہ اطہر تھا جس میں فروکش پسرِ ساقی کوثرؑ
ہفتم سے نہ کھانا تھا نہ پانی تھا میسّر تھے پیاس سے بیچین سبھی ہمدم و یاورؑ
جلتا تھا جگر سینوں میں تشنہ دہنی تھی
پردیس کا عالم تھا غریب الوطنی تھی

جنگل کی وہ ہیبت وہ درندوں کی صدائیں بچوں کو کلیجوں سے لگا لیتی تھیں مائیں
کہتی تھیں کہ جاں اپنی کہ بچوں کی بچائیں اس دشت پُر آفت سے کدھر حیف ہے جائیں

راہی ہوئے جس دن سے ادھر گھر سے خدا کے
راحت نہ میسر ہوئی بجز رنج و بلا کے

زینت وہ مسند تھے ادھر خلق کے والی
اور سامنے حاضر تھے اہالی و موالی
پیاسے تھے مگر چہرے پہ تھی سب کے بحالی
فاقے کئی دن سے تھے پہ ہمت وہی عالی
مشکور تھے فاقے کا نہ کچھ پیاس کا غم تھا
دل یادِ الٰہی سے نہ غافل کوئی دم تھا

اللہ وہ دربارِ شہنشاہِ خوش انجام
گویا تھا شگفتہ یہ چمن گلشنِ اسلام
تھے داہنے بازو کی طرف اکبرِ گلفام
بائیں حسنِ سبز قبا کے تھے گل اندام
اور سامنے نزدیک بہت شاہِ عرب تھے
بیٹھے ہوئے عباس دوزانو۔ بہ ادب تھے

تھے حاضرِ دربار جو سب مونس و یاور
فرماتے تھے اک ایک سے یوں سبطِ پیمبر
کل پیشِ دمِ صبح سے ہے جنگِ ستمگر
سرکے نہ قدم تن پہ رہے یا نہ رہے سر
راحت میں ہو یا رنج و مصیبت میں بشر ہو
لازم ہے کہ تائیدِ الٰہی پہ نظر ہو

ہر کام میں انسان کی تدبیر ہو صائب
خوش ہو کے کرے شکرِ خدا وقتِ مصائب
دل میں یہ سمجھ لے کہ وہ ہے حاضر و غائب
عَوناً لَّکَ[۱] فِی کُلِّ مَصَائِبَ وَ نَوَائِب
مشکل میں معاون ترا ہر آن وہی ہے
دکھ درد میں آفت میں نگہبان وہی ہے

---

[۱] یعنی تیرے لئے ہر مصیبت اور تکلیف میں مددگار ہے۔

ہر حال سے بندوں کے خبردار وہی ہے
ہر رنج و مصیبت میں مددگار وہی ہے

مرہم نہ زخمِ جگرِ افگار وہی ہے
داروئے شفائے دلِ بیمار وہی ہے

واقف ہے ہر آزارِ نہاں اور عیاں سے
نزدیک تمہارے ہے زیادہ رگِ جاں سے

ناگہ نظر آیا سحرِ غم کا سپیدا
تھے آپ تو محوِ صفتِ خالقِ یکتا

مشرق کی طرف غور کیا ہم نے جو مولاؑ
اکبرؑ نے یہ کی عرض حضورِ شہِ والا

ظلمت کی جگہ ہم کو سپیدی نظر آئی
گذری شبِ غم چاک گریباں سحر آئی

صبح شہادت کا سماں

سجدے میں خمیدہ وہ نہالِ گلِ خوشبو
وہ صبح کے عالم کا سماں دشت میں ہر سو

مرغانِ چمن اڑتے تھے کھولے ہوئے بازو
یاہو کا کہیں شور کہیں نالۂ کوکو

کہتے تھے کہ طاقت نہیں وصفِ صمدی میں
عاجز ہے زباں حمدِ جنابِ احدی میں

انصار و اعزہ لڑائی میں کام آچکے ہیں۔ حضرت علی اکبرؓ کے لاشۂ مبارک کو سپردِ خاک کرنے کے بعد امام عالیجاہ خیمۂ حرم میں داخل ہو کر کیا دیکھتے ہیں کہ معصوم علی اصغر شدّتِ تشنگی سے گہوارے میں دم توڑ رہا ہے +

جھولے سے لیا گود میں گھر سے ہوئے باہر
دیکھا جو یہ احوال تو رونے لگے سرور

اعدا سے مخاطب ہوئے یوں دشت میں آکر
گھوڑے پہ چڑھے اور روانہ ہوئے مضطر

کیوں بد گہرو اس پہ جو یہ جور و جفا ہے
بتلاؤ تمہیں کیا مرے بچے کی خطا ہے
دی بڑھ کے صدا حرملہ نے یا شہِ خوشخو
پانی کے عوض لیجیے پیکانِ سہ پہلو
بس گردنِ اصغر پہ لگا تیرِ جفا جو
جب حلق چھدا شاہ کا زخمی ہوا بازو
تڑپے نہ ذرا گود میں پیارے علی اصغر
بابا کے گلے لگ کے سدھارے علی اصغر

تشنگی

شدّتِ تشنگی سے حضرت علی اصغر جھولے میں مدہوش پڑے ہیں

ممکن جو نہیں پانی کئی روز سے پیہم
افسوس ہر دونوں لبِ لعلیں ہوئے نیلم
دیکھا جو دہنِ خشک تو با دیدۂ پُر نم
لینے لگے بوسے شہِ مظلوم بصد غم
مشتاق بہت تھے سفرِ خلدِ بریں کے
بہلا لیا آگے انہیں قربوس پہ زیں کے
روتے رہے در پر حرمِ شاہ زمانہ
رہوار بڑھا کر وہ ہوے رن کو روانہ
دل ماں کا ہوا تیرِ حوادث کا نشانہ
سب سوئے فلک تھیں نگراں مضطربانہ
تشویش یہی تھی کوئی تازہ نہ جفا ہو
اچھے نہیں سامان خدا جانے کہ کیا ہو

جب رونقِ میداں پُر آفت ہوئے آقا ٹھہرے صفِ اعدا کے مقابل تنِ تنہا
دیکھا کبھی گردوں کو کبھی جانب دریا کچھ پانی طلب کیجئے تھا دل میں ارادہ
گو کام نہیں ہے انہیں حیدر کے خلف سے
باقی کوئی حجت نہ رہے اپنی طرف سے
آخر فوجِ اشقیا سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں
سب دیلم و ترک ستم ایجاد ہوں سیراب بچے صفتِ ماہیٔ بے آب ہوں بیتاب
پیاسے رہیں اس گرمی میں سادات خوش القاب جز آبِ دمِ تیغ نہ پائیں مرے احباب
یوں زندگی دشوار ہو عالی نسبوں کو
اک قطرہ نہ پانی کا ملے تشنہ لبوں کو
گر زعم میں تم سب کے گنہگار ہے شبیر بتلاؤ تو اس بچے کی ہے کونسی تقصیر
پیاسا ہے کئی دن سے بہت حال ہے تغیر پانی کا طلبگار ہے تم سب سے یہ بے شیر
بس اس کو پلا دو نہ کوئی اور پیئے گا
گر آج بھی پانی نہ پیئے گا نہ جیئے گا
موجود تھا واں حرملہ ظالم و بے پیر مارا اسی بیرحم نے اس بچے کو اک تیر
حلقوم پہ بیٹھا تو تڑپنے لگا بے شیر مُنہ کر کے سوئے چرخ یہ کہنے لگے شبیر
اے بارِ خدا اے مرے مالک مرے مولا
کیا کیا نہیں احسان ہیں مجھ پر ترے مولا
یہ کہہ کے دلِ پاک کو ہر چند سنبھالا صدمہ ہوا اس درجہ کیا نالے پہ نالا
اور تیر کو معصوم کی گردن سے نکالا نزدیک یہ تھا سارا جہاں ہو تہ و بالا

تیور جو بدلنے لگے نازوں کے پلے کے
شبیر نے ہاتھ اپنا رکھا نیچے گلے کے
ہر حال میں شفقت تھی بہت گرچہ پدر کی — اُس زخم سے حالت متغیر تھی پدر کی
اس طرح سے جب پیاس بجھی تشنہ جگر کی — ہو کر متبسّم رُخ حضرت پہ نظر کی
بابا کی طرف دیکھتے ہی مر گئے اصغرؑ
رونے لگے شبیرؑ قضا کر گئے اصغرؑ

مرزا دبیر

بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے — بچّے کی نبض دیکھ کے ماں بدحواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کے ملنے کی آس ہے — پھرتی ہے آس پاس یہ جینے سے یاس ہے
کہتی تھی کیا کروں میں دہائی حسینؑ کی
پتلی پھری ہے آج مرے نورِ عین کی
سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم — پھیلا رہے ہیں سمٹے ہوئے پاوں کو حرم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دمبدم — چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

حضرت علی اصغر کی حالت غیر ہوجاتی ہے اور آپ میں رمق، جان باقی رہجاتی ہے۔ تو امام عالیجاہ اس شیر خوار کو ہاتھوں پر اٹھا کر فوج شام کی طرف

روانہ ہوتے ہیں۔

ہاتھوں پہ لیکے اس کو چلے شاہِ اتقیا اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
تھا بے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا اصغر پہ ماں نے ڈالدی اجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرۂ پُر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفا لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہونگا کیا
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا منت بھی گر کروں گا تو دینگے بھلا وہ کیا
پانی کے واسطے نہ سنینگے عدو مری
بچے کی جان جائیگی اور آبرو مری

محاکات

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لیکے آئے ہیں

تاثیرِ بیان

پھر ہونٹھ بے زبان کے چومے جھکا کے سر رو کر کہا جو کہنا تھا سو کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زبان لبوں پہ جو اس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں لی حرملہ نے شانہ سے دو ٹانگ کی کماں
ترکش سے چُن کے کھینچ لیا تیر جانستاں جوڑا کماں میں تاک کے حلقوم بیزباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
گھبرا کے غش سے کھولدیں آنکھیں صغیر نے

منہ آسماں سے شہ نے پھرایا کہ کیا ہوا دیکھا کہ پار حلق سے تیرِ جفا ہوا
بچّہ تڑپ رہا ہے۔لہو میں بھرا ہوا یوں دیکھتا ہے جیسے کہ کوئی ڈرا ہوا
آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں
آگے تو دودھ اُگلتے تھے اب خون اُگلتے ہیں

شہ نے کہا لعینوں سے کیوں ای جوان و پیر ہم نے کہا تھا کیا جو بھلا تم نے مارا تیر
تم سے کلام کرتا تھا میں یا کہ یہ صغیر اس بیزبان نے تو نہ مانگا تھا آب و شیر
ثابت علی کے پوتے کی تم نے خطا نہ کی
تم نے ہمارے لانے کی بھی کچھ حیا نہ کی

لاشے کے منہ کو دیکھکے کہنے لگے یہ شاہ بیچارگی کا وقت ہے اصغر خدا گواہ
ماں ہیگی گھر میں باپ یہ یاں نرغہ سپاہ یہ ریگ گرم اور یہ بدن نرم نرم آہ
دِل ساتھ نکلا پڑتا ہے کیونکر جدا کروں
سونپوں کسے لٹاؤں کہاں آہ کیا کروں

انیس

امام عالیجاہ حضرت علی اصغر کو لیکر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

جاتے وقت حضرت شہربانو کو تلقین صبر فرماتے ہیں۔

شہ نے کہا تقدیر سے مجبور ہے شبیّر ۔ کچھ مرضی معبود میں چلتی نہیں تدبیر
اللہ کو کر یاد نہ ہو مضطر دلگیر ۔ جاتی رہیگی تشنگی اصغر بے شیر

اسی سلسلہ بیان میں کہتے ہیں

سمجھا کے انہیں رن کو چلے سید مظلوم ۔ اور ہاتھوں پہ رکھے ہوئے وہ ننھا سا معصوم
لشکر کے قریں آکے کہا با دل مغموم ۔ یہ پیاس ہے جو خشک ہے اس بچے کا حلقوم
تم روح پیمبر[ص] پہ یہ احسان کرو گے
سیراب جو بچہ مرا اس آن کرو گے

شہ کر رہے تھے آہ یہ رو کر ابھی تقریر ۔ جو تیر و کماں لے کے بڑھا حرملہ بے پیر
ناگاہ لگا اصغر بے شیر کے اک تیر ۔ بچے کا چھدا حلق بھی اور بازوئے شبیر[ع]
صدمہ تھا عجب دل پہ شہ عرش نشیں کے
جب سہم کے لپٹا وہ گلے سرور دیں کے

اس دم شہ مظلوم نے دیکھا سوئے افلاک ۔ اور عرض کی خالق سے بایادیدۂ نمناک
وہ ظلم کیے مجھ پہ کلیجہ ہوا صد چاک ۔ دے داد کہ فریادی ہے ابن شہ لولاک[ؐ]

[ص] یعنی حضرت امام حسین

مظلوم پہ سیّد پہ مسافر پہ جفا کی
معصوم کو مارا ہے دہائی ہے خدا کی

میر مونس

جب رہ گئے تنہا شہ دیں دشت ستم میں
تھمتے نہ تھے اشک آنکھوں سے فرزند کے غم میں
فرماتے تھے اپنا بھی سفر ہے کوئی دم میں
ہوتا ہے اب آخری رخصت کو حرم میں

اس کے بعد لکھتے ہیں

یہ کہکے پھرے رن سے شہنشاہ دو عالم
فرمانے لگے لاشں پہ عباس کے ماتم
روتے تھے جو لاش علی اکبر پہ بصد غم
لب خشک تھے سوجے ہوئے تھے دیدۂ پرنم
ہر چار طرف تکتے تھے حسرت کی نظر سے
ہر ایک قدم آہ نکلتی تھی جگر سے

حضرت امام خیمہ حرم میں پہنچتے ہیں تو حضرت سکینہ پاؤں سے لپٹ جاتی ہیں۔

بانوئے حزیں اتنے میں روتی ہوئی آئی
مردے کی طرح ہاتھوں پہ اصغر کو بھی لائی
چلائی کہ اکبر نے تو جان اپنی گنوائی
اٹھارہ برس کی مری لوٹی ہے کمائی
کس سے کہوں جو داغ کلیجے پہ سہے ہیں
باقی ہیں اب اصغر سو یہ دم توڑ رہے ہیں


حضرت مونس

یہ سنتے ہی مہر پدری کا ہوا اک جوشش رونے لگے دیکھا علی اصغر کو جو بیہوش
لیکر اُسے آغوش میں وہ شاہ کفن پوش خیمے سے چلا سر کو جھکائے ہوئے خاموش
اس وقت عجب حال سے وہ تشنہ جگر تھا
لختِ جگر آنکھوں میں تھے دامن میں پسر تھا
اس چاند کے ٹکڑے پہ اڑھائے تھے جو دامن فانوس میں اک شمع نظر آتی تھی روشن
جا پہنچے جو نزدیک جھکائے ہوئے گردن ہنس ہنس کے تب آپس میں یہ کہنے لگے دشمن
لو پانی طلب کرنے کو یاں آئے ہیں شبیر
سوکھی سی کوئی مشک اُٹھا لائے ہیں شبیر
لشکر کے پاس پہنچکر حضرت نے رخِ اصغر کو بے نقاب کر دیا اور کہنے لگے۔
دو دن سے جو ہے پانی سے محروم یہی ہے
دیکھو چھ مہینے کا وہ معصوم یہی ہے
شمر ستم ایجاد نے کی بڑھ کے یہ تقریر کیا سوچ کے اس بچے کو یاں لائے ہیں شبیر
پانی کی گدائی کی تو اچھی ہے یہ تدبیر یہ کہہ کے پکارا وہ کہ ہاں جلد چلیں تیر
بسمل سے تڑپتے رہیں شبیر میں دیکھوں
ہو جائے یہ بچہ ہدفِ تیر میں دیکھوں
کچھ خوفِ خدا او لعین نہ لائے وہ جفاکار بوچھار ہوئی تیروں کی اس بچے پہ اک بار
جھک جھک کے بچانے لگا اسکو شہِ ابرار چلائے یہ کیا کرتے ہو اے قوم ستمگار
مجرم ہوں میں زخمی جو کرو مجھ کو بجا ہے
اے ظالمو بچہ مرا بے جرم و خطا ہے

سنتا نہ تھا کوئی شہِ مظلوم کی فریاد
بیجرم و خطا ہوتی تھی معصوم پہ بیداد
ہنستا ہوا نکلا ابن کاہل ستم ایجاد
اور لعین ہوا قتل پہ بیچھے گے وہ جلاد
چلّے سے کمان کے لب سوفار ملا کر
تا کا علی اصغر کا گلا ہاتھ اٹھا کر

تیر لگتے ہی

بسمل کی طرح ہاتھ پہ تڑپا علی اصغرؑ
دم رک گیا اور جسم لگا کانپنے تھر تھر
منھ کھول دیا ننھا سا اشک آنکھوں میں بھر کر
بچے کو لئے بیٹھ گئے خاک پہ سرور
کھینچا جو ہیں پیکان ستم اس کے گلو سے
تر ہو گیا کرتا علی اصغر کے لہو سے
منہ ملنے لگے بچے کے منہ سے شہِ ذیشان
کہتے تھے یہ بابا تری مظلومی کے قربان
پچھتایا میں خیمے سے تمہیں لا کے میری جان
تقصیر ہوئی باپ سے اے اصغرِ نادان
کیا قہر ہے دم توڑو تم اور زندہ ہو شبیّر
قسمت میں یہ تھا بانو سے شرمندہ ہو شبیّر
رو رو کے یہ کہتے تھے شہِ بیکس و بے پر
اتنے میں لگے ہچکیاں لینے علی اصغر
کس پیار سے دیکھا رخ فرزند پیمبرؐ
اور سرد ہوئے نرگسی آنکھوں کو پھرا کر
چلائے کہ پانی نہ دیا مر گئے اصغر
لو ظالمو دنیا سے سفر کر گئے اصغر

تاثیرِ بیان

اس وقت چلے لاش کو چھاتی سے لگا کر
ہر گام پہ رو دیتے تھے گردن کو جھکا کر

بانو کو پکارے یہ درِ خیمہ پہ جاکر لیجاؤ انہیں آئے ہیں یہ پیاس بجھاکر
کملا گئے ہیں دھوپ میں دامن سے ہوا دو
صاحب انہیں گہوارے میں لیجا کے سلادو

جب تیرِ ستم کھا کے قضا کر گئے اصغرؓ حق باپ کا بچپن میں ادا کر گئے اصغرؓ
جاں اپنی رہِ حق میں فدا کر گئے اصغرؓ رو کر کہا حضرت نے یہ کیا کر گئے اصغرؓ
جھولے سے بھی بیزار ہوئے گھر کو بھی چھوڑا
بابا کو بھی تنہا کیا مادر کو بھی چھوڑا

ماں باپ کے گھر میں چھ مہینے رہے مہماں افسوس ہوئی سال گرہ بھی نہ مری جاں
مادر کی بھری گود کو تم کر گئے ویراں یہ حلق کہاں اور کہاں تیر کا پیکاں
بابا ترے صدقے مرے بھولے علی اصغرؓ
زخمی ہوئے پر منہ سے نہ بولے علی اصغرؓ

کیا درد سہا تیر کا اللہ رے شجاعت حلقوم[1] چھدا خوں میں بھری چاند سی صورت
لپٹے رہے بازو سے پدر کے بصد الفت دم توڑ کے ہاتھوں پہ مرے کر گئے رحلت
آفت زدہ جاں خانۂ تن سے نکل آئی
چھوٹی سی زباں خشک دہن سے نکل آئی

ایذائے سفر ایک تو رستے میں اٹھائی اور دوسرے راحت کسی منزل میں نہ پائی
تقدیر جب اس دشتِ بلاخیز میں لائی گھر پہ ہوئی ماں باپ کے اعدا کی چڑھائی

[1] حلقوم بمعنی حلق

دو روز رہے شام سے بیچین سحر تک
اس دھوپ میں پیاسے رہے چو بیس پہر تک
غم کھاتی رہی آٹھ پہر یا نے دلگیر
واں پانی ہوا بند ادھر خشک ہوا شیر
سمجھا تھا کہ پانی تمہیں دیگا کوئی بے پیر
لایا تو یہاں لاتے ہی گردن پہ لگا تیر
اس ظلم کا دھڑکا تھا مجھے رات سے بیٹا
ہاتھ آیا نہ کچھ کھویا تمہیں ہات سے بیٹا

ہوئے جو پیاس سے جھولے میں نیمجاں اصغر رضہ
صغیر و تشنہ و بے شیر و بے زباں اصغر رضہ
پھرا کے آنکھیں لگے لینے ہچکیاں اصغر رضہ
پکاری بانوی بیکس چلے کہاں اصغر رضہ
ذرا سی عمر میں کیوں ہمسے منہ کو موڑتے ہو
قصور کیا ہے جو مادر کا ساتھ چھوڑتے ہو
اسیر درد و الم ہوں میں خستہ جاں بیٹا
جگر میں درد ہے آنکھیں ہیں خونچکاں بیٹا
جہاں سے اُٹھ گیا اکبر سا نوجواں بیٹا
چلے جو تم بھی تو پھر زندگی کہاں بیٹا
نہ موڑو آنکھ پیمبر صلعم کا واسطہ اصغر
دغا نہ دو علی اکبر رضہ کا واسطہ اصغر
بیان کرتی تھی اور روتی جاتی تھی مادر
صدف کی طرح سے کھولے ہوئے تھے منہ اصغر
رکا ہے دم دل الجھتا ہے سینہ کے اندر
کبھی غش آتا ہے چونک اٹھتے ہیں کبھی رو کر
یہ دکھ ہے جان پہ اور عمر میں ذرا سے ہیں
اشارہ نرگسی آنکھوں سے ہے کہ پیاسے ہیں

کیا ہے جھولے کے نزدیک بیبیوں نے ہجوم
بلائیں بچے کی لیتی ہیں زینب مغموم
ہوا بھتیجے کو قرآں کی دیتی ہیں کلثوم
بپا ہے شور کہ مرتے ہیں اصغر معصوم

پدر کو ماں کو ضعیفی میں داغ دیتے ہیں
گلا ہے سوکھا ہوا الٹی سانس لیتے ہیں

یہ شور سنکے شہ خاص و عام رن سے پھرے
گئے تھے تشنہ دہن تشنہ کام رن سے پھرے
سوئے خیام فلک احتشام رن سے پھرے
ہوا یہ ڈیوڑھی پہ غل لو امام رن سے پھرے

غش آ نہ جائے کہیں زخم کھائے آتے ہیں
قبا ہے سرخ لہو میں نہائے آتے ہیں

آپ نے آتے ہی حضرت زینب سے دریافت کیا۔

خبر کہو علی اصغر کی جلد اے ہمشیر
گیا جہاں سے کہ زندہ ہے میرا طفل صغیر
کہا بہن نے کہ ہے جاں بلب وہ ماہ منیر
جو مر گیا تو جیے گی نہ بانوئے دلگیر

جواں پسر تو جہاں سے ابھی سدھارا ہے
اب ایک زیست کا اس کی یہی سہارا ہے

تسلیم و رضا

کہا حسین نے جو کچھ ہو خواہش تقدیر
قصور ماں کا نہ اس میں نہ باپ کی تقصیر
جوان مرتے ہیں اور دیکھتے ہیں آنکھوں سے پیر
سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں صغیر و کبیر

مرے کہ جیتی رہے ماں پسر جدا ہوگا
طلب ادھر سے ہو تو پھر کسی سے کیا ہوگا

اس کے بعد کہتے ہیں۔ کہ

قریب جھولے کے جب شاہِ بحر و بر آئے
پسر کو جھک کے جو دیکھا تو اشک بھر آئے
ہلا کے سر کو کہا ہائے میرے رشکِ چمن اٹھا کے تکیے پہ رکھی ڈھلی ہوئی گردن
کبود دیکھے جو لب رکھ دیا دہن پہ دہن عبا اڑھائی کہ ہو جائے گرم سرد بدن
جو دیکھی نبض تو ٹکڑے جگر کے ہونے لگے
وہ ہاتھ نبض سے آنکھوں پہ دھر کے رونے لگے

اس کے بعد امام عالیجاہ حضرت علی اصغر کو ہاتھوں پر اٹھا کر لشکرِ شام کی طرف لیجاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

قریب فوج جو پہنچے تو بولے بانیٔ شر لئے ہیں زیرِ قبا کیا امامِ جنّ و بشر
پکارا شمر کہ قرآن ہے شہ کے ہاتھوں پر کہا کسی نے نہیں مر گیا ہے کوئی پسر رضی
رواں ہیں آنکھوں سے اشک اور سر جھکائے ہیں
ہمارے سامنے میّت کو لے کے آئے ہیں

امام عالی مقام نے

یہ سنکے منہ سے پسر کے اٹھا دیا دامن ستارہ سحری تھا کہ ہو گیا روشن
پکارا حرملہ کو بڑھ کے شمر ذی الجوشن تِرا نشانہ ہے اس کی ڈھلی ہوئی گردن
بچے نہ سینۂ سجاد کے تلے اصغر رضی
لگا وہ تیر کہ ہچکی تلک نہ لے اصغر رضی
بڑھا یہ سنکے پرے سے وہ مثلِ ابلِ دماں اٹھائی جوڑ کے تیر ستم شقی نے کماں
بہت پسر کو بچایا کئے امامِ زماں مگر ملی ہے کسے پنجۂ اجل سے اماں

مڑے ادھر سے ادھر کو تو زخمی بازو تھا
گلے میں نیچے کے تیر ستم تہ ازو تھا

محاکات

رُکی جو سانس تو چلائے اصغرِ مہ رو
تڑپ کے کھول دیا منہ ٹپک پڑے آنسو
دہن سے دودھ بہا حلق نازنیں سے لہو
ہلال بن گیا خوں کی شفق میں طوقِ گلو
دکھائی شکل اجل نے تو ڈر گئے اصغرؑ
لپٹ کے باپ کی چھاتی سے مرگئے اصغرؑ

انیس

حضرت امام حسینؑ حضرت علی اصغر کو لشکرِ غنیم کے روبرو لے کر جاتے ہیں

بیچین و مضطرب تھے جو اہلِ حرم تمام
واں پہنچا ماہِ فاطمہ نزدیک فوجِ شام
کملا گیا تھا دھوپ سے رُخسارِ لالہ فام
روتے تھے دیکھ دیکھ کے صورت شہِ انام
دلبر کو زیرِ سینۂ انور چھپائے تھے
دامن عبا کا چاند سے رُخ پر اُڑھائے تھے

ٹھہرے پہنچ کے متصلِ فوجِ اشقیا
چاہا کہ پانی مانگیں پہ مانع ہوئی حیا
آپس میں ذکر کرنے لگے بانیٔ جفا
کیا شے چھپا کے لائے ہیں سلطانِ کربلا
بولا کوئی کہ جنگ سے عاجز اب آئے ہیں
قرآن صلح کیلئے ہاتھوں پہ لائے ہیں

آپ فوج اشقیا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ہے کہ یہ قرآن پاک نہیں ہے میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔

دم توڑتا ہے سوزِ عطش سے یہ نونہال | بیرحم ہو جائے رحم ہے کچھ تو کرو خیال
یہ بیزباں ہے غنچہ صفت کیا کرے مقال | اس کی طرف سے کرتا ہوں تم سب سے میں سوال
پانی اسے برائے خدا دو مجھے نہ دو
آکر تم آپ اس کو پلا دو مجھے نہ دو

اس وقت شمر شقی القلب حُرملہ کی پیٹھ ٹھونک کر کہتا ہے۔ کہ ہاں دوست تیری تیر اندازی اور ثبوت وفاداری کا زریں موقع ہے۔

یہ سُنکے لیس قتل پہ وہ بیحیا ہوا | چلے میں جوڑا تیر کو درد او حسرتا
گوشے کماں کے کھینچ کے دونو دیئے ملا | تا کا خطا شعار نے مظلوم کا گلا
پیکاں چھٹا تو گردنِ نازک ہدف ہوئی
دولت علی کے لال کی بالکل تلف ہوئی

تیرِ ستم رُکا نہ کسی طرح راہ میں | در آیا حلق چھید کے بازوئے شاہ میں
عالم سیاہ ہو گیا سارا نگاہ میں | باقی تھی جان ایک رمق رشکِ ماہ میں
بولے نہ کچھ تڑپ کے جہاں سے گذر گئے
اصغر اُگل کے مُنہ سے لہو ہائے مر گئے


حضرت اُنس

تعشق

شدتِ تشنہ لبی سے حضرت علی اصغر جھولے میں مدہوش ہو جاتے ہیں معصوم بچے کی یہ حالت دیکھکر

بیتاب ہوا سینۂ سرور میں دل زار — ہٹ ہٹ گئے ناموس بڑھے سید ابرار
جھولے کے قریب آئے شہنشاہ خوش اطوار — دیکھا کہ ہیں اصغر بھی شہادت کے طلبگار
تکیئے میں تر آیا ہے عرق متّصل ایسا
گہوارے کو جنبش ہے تڑپتا ہے دل ایسا

ہے خشک دہن غنچۂ پژمردہ کی تمثال — ماتھے پہ عرق آنے سے جم جم گئے ہیں بال
یوں پاؤں رگڑتے ہیں کہ دل ہوتے ہیں پامال — سوزِ جگر و دل سے ہے تغییر بہت حال
تن سرد ہے دریا جو پسینے کا بہا ہے
نبضوں میں تلاطم ہے کہ جی ڈوب رہا ہے

جب پھول سے ہاتھوں کو ٹپکتا ہے وہ مضطر — اک چوٹ سی لگتی ہے دلِ سرورِ دیں پر
آنکھیں جو پھرا تا ہے وہ برگشتہ مقدّر — سینوں میں الٹ جاتے ہیں دل صورتِ ساغر
منہ خشک جو ہے غم سے جگر جلتے ہیں سب کے
یوں مٹھیاں باندھے ہیں کہ دل ملتے ہیں سب کے

حضرت امام حسین علیہ السّلام حضرت شہر بانو کی رضامندی سے حضرت علی اصغر رضہ کو لشکرِ غنیم کے روبرو لیجاتے ہیں

اصغر کو ادھر لے کے روانہ ہوئے سرور — روتی رہیں پردے کے اودھر بانوی مضطر
ہے جسمِ شلوکے سے عیاں مثلِ گل تر — لپٹا ہوا کرتا ہے پسینے میں جو ہیں تر

کب غرق عرق لختِ دلِ سرورِ دیں ہے
آلودۂ شبنم گلِ فردوسِ بریں ہے

اندازِ بیان

آغوشِ مہِ نو میں جھلکتا ہے ستارا — ہے گود میں اس طرح سے شبیر کا پیارا
حضرت کو ہوا کا نہیں منظور گذارا — اس شمع سے پرنور بیابان ہے سارا

اللہ رکھے خلق میں اس جلوہ گری کو
دامن میں چھپائے ہیں چراغِ سحری کو

حضرت علی اصغر کے متعلق کہتے ہیں۔

لپٹے ہوئے ہیں سینۂ سلطانِ زمن سے — پرہول جو باجوں کی صدا آتی ہے رن سے
معلوم یہ ہوتا ہے چلی روح بدن سے — اُکرہ جو ہوا گرم نکل جاتی ہے سن سے

جلتی ہوئی ریگ آنکھوں میں پڑتی ہے جو آکے
منہ ملتے ہیں سینہ سے امامِ دوسرا کے

وہ گھر ہے نہ بہنوں کی نہ مادر کی صدا ہے — معصوم کو حیرت ہے کہ یہ سانحہ کیا ہے
شور دہل و طبل سے رن گونج رہا ہے — گھوڑوں کے سموں کی ہے صدا حشر بپا ہے

ہے تُند ہوا گرد میں پوشیدہ فلک ہے
سناٹے ہیں تیروں کے کمانوں کی کڑک ہے

ہاں بھائیو ہر گھاٹ کو روکے رہو ہشیار — دریا کے نگہبان صدا دیتے ہیں ہر بار

مینہ تیروں کا برسے اگر آئے کوئی اس پار
پیاسا کوئی اس سمت سے گذری نہ خبردار

قطرہ اُسے پانی کا ندو تشنہ لبی ہیں
بچہ بھی جو ہو آلِ رسولِ عربی ہیں

یاں یہ اُدھر تھیں کہ پکارے شہِ ناشاد
اے قومِ جفا کارو لعین وستم ایجاد

موجود ہوں میں مجھ پہ جو منظور ہے بیداد
لڑکوں پہ کرو رحم کہ ہو صاحبِ اولاد

مجرم مجھے سمجھے ہیں جو سب ور پئے کیں ہیں
اچھا مرے بچے تو گنہگار نہیں ہیں

چوپائے تک اس نہر سے پی جاتے ہیں پانی
بجھتی ہے پرندوں کی یہاں تشنہ دہانی

معصوموں پہ بھی رحم مگر کیا نہیں آتا
بچہ یہ تڑپتا ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

اسی سلسلہ بیان میں کہتے ہیں

تڑپا کئے ہیں رات کو بچے مرے سارے
سویا نہیں تا صبح کوئی پیاس کے مارے

یہ لال ہے اولاد پیمبرؐ کی تمہارے
تم گود میں لے جاؤ اسے نہر کنارے

اپنے لئے مجھ کو طلب جام نہیں ہے
میں دور کھڑا ہوں مجھے کچھ کام نہیں ہے

وہ پیاس ہے اس کو کہ نہیں کہنے کے قابل
سوزش سے پھڑکتا ہے دل صورتِ بسمل

سینے پہ ذرا ہاتھ کا رکھنا بھی ہے مشکل
چھاتی سے لگاتا ہوں تو جلتا ہے مرا دل

دیکھی نہیں حالت یہ کسی تشنہ دہن کی
تم تک تو پہنچتی نہیں آنچ اسکے بدن کی

پانی کی کمی کچھ نہیں موجود ہے دریا لیجاتے ہیں بچوں کے لئے طائر صحرا
لٹتا ہے پڑا آب تمہیں کچھ نہیں پروا سب کھیت ہیں سیراب یہ معصوم ہے پیاسا
زنبہ نہیں کچھ نخل و گل و برگ و ثمر کا
ٹکڑا ہے یہ محبوبؐ الٰہی کے جگر کا

اللہ رے صبر دل شاہنشہ دلگیر یوں منہ پہ دھرا ہاتھ تہ گردن بے شیر
اک ہاتھ سے بس کھینچ لیا شاہ نے وہ تیر قبلہ کی طرف پھرتے ہی حالت ہوئی تغییر
دو مرتبہ کانپا بدن اور مر گئے اصغرؓ
تکبیر کہی شہ نے قضا کر گئے اصغرؓ

ہدیہ درویش

بس ہاتھوں پہ میّت کو اٹھا کر شہ والا یوں کرنے لگے عرض کہ اللہ تعالےٰ
تو راحم و غفار ہے تو بخشنے والا اک اور یہ حاضر ہے مری گود کا پالا
رحمت سے تیری داغ جگر پھول ہو مالک
درویش کا ہدیہ ہے یہ مقبول ہو مالک

آخر علی اصغر جو گئے باغ جہان سے لازم ہے کہ اُف تک نہ نکالوں شہ زباں سے
مالک مجھے کیا کام کسی تشنہ دہاں سے سمجھوں تو ذرا میں انہیں لایا تھا کہاں سے
معبود ہے تو عبد یہ ناچیز حزیں ہے
مملوک کو دعویٰ کوئی مالک سے نہیں ہے

اس وقت امام نے حضرت علی اصغر کو مدفون کرنے کے لئے چھوٹی سی قبر تیار کی۔ پھر لاشے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

کچھ بھی نہ رہے دہر میں اے اصغر مہ لقا | کل آئے سوئے خلد چلے آج میری جاں
جیسے ہو کسی غیر کے گھر میں کوئی مہمان | تھے یہ چھ مہینے مگر اک خواب پریشاں
چلنے بھی نہ پائے کہ قضا کر گئے بیٹا
جی بھر کے نہ دیکھا تھا کہ تم مر گئے بیٹا

جب حسرت و حرماں کی یہ باتیں ہوئیں آخر | طوق اصغر ناداں کے بڑھا کر شہ صابر
منہ چوم کے بولے مرے ننھے سے مسافر | تربت ہو مبارک لے خدا حافظ و ناصر
مٹی میں ملایا وہ ستارہ شہ دیں نے
فرزند کو تربت میں اتارا شہ دیں نے

تھا چاند کے ٹکڑے سے جو پیارا رخ فرزند | دیکھا کئے تا دیر جھکے شاہ خردمند
پیوند زمیں اپنے جگر کا کیا پیوند | دنیا ہوئی آنکھوں میں سیہ قبر جو کی بند
اشکوں سے رخ پاک کو دھویا کئے حضرت
منہ قبر پہ رکھے ہوئے رویا کئے حضرت